اصلاح معاشرہ

سورہ حجرات کی روشنی میں

بلال عبدالحی حسنی ندوی

ناشر
سید احمد شہید اکیڈمی، دار عرفات،
تکیہ کلاں، رائے بریلی

طبع اول

۱۴۳۰ھ/ ۲۰۰۹ء

نام کتاب: اصلاح معاشرہ (سورہ حجرات کی روشنی میں)
مؤلف: بلال عبدالحی حسنی ندوی
صفحات: ۱۵۲
کمپوزنگ: محمد اسحٰق ندوی

ناشر
سید احمد شہید اکیڈمی، دار عرفات،
تکیہ کلاں، رائے بریلی

فہرست

عالمگیر فساد

اعمال کی خاصیتیں

اصلاح کی دعوت

آپس کے جھگڑوں کا وبال

صلح صفائی کا حکم

صلح کرانے کے آداب

اخوت اسلامی

ایمانی اخوت کی طاقت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا......

فیض تربیت

صحابہ کی زندگی

رشتہ محبت

زندگی کا مزہ

اصلاح معاشرہ کے قیمتی اصول

قومی عصبیت

اسلام کی تعلیم

خواتین سے خطاب

''لمز''

برے ناموں سے پکارنا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

از حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ
ناظم ندوۃ العلماء وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على رسوله الكريم خاتم النبيين محمد بن عبد الله الأمين وعلى أصحابه الغرّ الميامين وبعد فقد قال الله تعالى في كتابه المبين ﴿وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَاباً فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ (انبیاء/۱۰) (ہم تمہارے پاس ایسی کتاب بھیج چکے ہیں کہ اس میں تمہاری نصیحت موجود ہے، کیا پھر بھی تم نہیں سمجھتے)۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس بات کی طرف متوجہ کیا ہے کہ ہم اپنے حال وچال کے لیے اس کے اس صحیفہ سماوی کو جو اس نے آخری آسمانی صحیفہ کے طور پر اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا اپنے پیش نظر رکھیں کہ اس میں ہمارے بھی حالات زندگی کے لیے رہبری فرمائی ہے، یہ رہبری اس امت کے لیے جو نبی آخرالزماں کی امت کہلاتی ہے پوری طرح لائق توجہ واستفادہ ہے، اس امت کے علاوہ دیگر امتوں میں دین کو اپنے اندازہ سے طے کردہ عقیدہ وعبادت تک محدود سمجھا گیا ہے لیکن امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کے لیے دین صرف مذکورہ دو پہلوؤں تک محدود نہیں رہا بلکہ زندگی کے دیگر پہلوؤں پر بھی مشتمل رکھا گیا ہے، اس میں آپس کے تعلقات اور ایک دوسرے پر ایک دوسرے کے حقوق، دوستی اور دشمنی

کے حدود، ظلم وزیادتی اوراسی طرح کے دیگر پہلوسب دین کے زمرہ میں آتے ہیں اور ان سب میں ہم کوقرآن مجید سے رہبری ملتی ہے،قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں جگہ جگہ ان مذکورہ امور کے سلسلہ میں توجہ دلائی گئی ہے اور بعض سورتوں میں انفرادی اخلاق اوراجتماعی حقوق کا تذکرہ زیادہ وسعت کے ساتھ کیا گیا ہے مثلاً سورۃ الحجرات میں متعدد اخلاقی واجتماعی امور میں صحیح طریقہ اختیار کرنے اور اخلاق حسنہ اپنانے کی ہدایت کی گئی ہے،عقیدہ وعبادت کے ساتھ اخلاقی واجتماعی معاملات میں وابستگی کو دین کا جزءِ لاینفک قرار دیا گیا ہے اور مسلمان کا اسلام ان سب پرعمل کرنے پر ہی مکمل اسلام بنتا ہے، چنانچہ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ اس بات کا خیال رکھے کہ اس کا دین ناقص دین نہ رہے بلکہ کامل دین ہو، دین کے تمام پہلوؤں پرعمل کرنے پر ہی دین کامل ہوگا اوراسی میں جامع دین کی صفت پیدا ہوگی لیکن افسوس ہے کہ اکثر لوگ اخلاقیات اور اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے لیے مقرر کردہ اصول جو قرآن مجید میں اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بتائے گئے نظرانداز کردیتے ہیں اوردنیا میں دیگر قوموں کا جوچلن ہے اسی کو اختیار کرتے رہتے ہیں۔

اس میں ایک کوتاہی ہمارے علماء دین کی بھی ہے کہ وہ جس طرح عقائد و عبادات کی تصحیح وتلقین کی کوشش کرتے ہیں لوگوں کے اخلاق وصفات ومعاملات کوبھی اسلامی صفت کا اور دینی روح کا بنانے کی طرف بھی توجہ دلائیں، اجتماعی زندگی اور انفرادی اخلاق اوراہل تعلق کے حقوق اورانسانی خصوصیات کا بہتر طریقہ اختیار کرنے سے جومعاشرہ وجود میں آتا ہے وہ بلند کردار کا انسانی معاشرہ بنتا ہے جس میں سب کو راحت حاصل ہوتی ہے اور ہمدردی اور آپس کا تعاون اوراخلاقی برتاؤ اور خیر پسندی کی صفات عمل میں آتی ہیں، سورۂ بنی اسرائیل میں، سورۂ لقمان میں، سورۂ حجرات میں خاص طور پر ایک ہی جگہ متعدد اخلاقی نصیحتیں ملتی ہیں، ان میں خود اپنے کو اچھے کردار کا

بنانا اور دوسرے کے جو حقوق بنتے ہیں ان کا لحاظ کرنا اور پروردگار عالم کی عطا کردہ نصیحتوں سے صحیح طور پر اور مناسب ڈھنگ سے فائدہ اٹھانا اور دوسروں کو فائدہ پہنچانا بتایا گیا ہے۔

ہم کو مسرت ہے کہ مولوی بلال عبدالحی حسنی ندوی نے اپنے دیگر علمی و دینی کاموں میں یہ کام بھی شامل کیا کہ قرآن مجید کی سورۂ حجرات کی روشنی میں ان اعمال صالحہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور بہت سلیقہ سے ان باتوں کی تلقین کی ہے، زبان اور اسلوب سہل اور آسان رکھا ہے جس کو پڑھنے والا اس میں دلچسپی محسوس کرے گا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی یہ کوشش زیادہ سے زیادہ نافع ہو اور اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت حاصل کرے۔

محمد رابع حسنی ندوی
دائرہ شاہ علم اللہ، تکیہ کلاں
رائے بریلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دو باتیں

عرصہ سے خیال تھا کہ سورۂ حجرات کی روشنی میں معاشرہ کی اصلاح کا دستورالعمل پیش کیا جائے، جب استاذ محترم مولانا نذرالحفیظ ندوی صاحب نے ''تعمیر حیات'' میں سلسلہ وار کچھ لکھنے کا حکم فرمایا تو اسی مضمون کی طرف ذہن گیا اور ایک ایک آیت پر مضامین کا سلسلہ شروع کیا گیا، اللہ کا شکر ہے کہ وہ تکمیل کو پہنچا تو مستقل رسالہ کی شکل میں عمومی فائدہ کے لیے اس کی اشاعت مناسب معلوم ہوئی، بس وہی مضامین ناظرین کی خدمت میں پیش ہیں، جو کچھ مفید باتیں سامنے آئیں وہ محض اللہ کی توفیق سے ہیں اور جو غلطیاں دیکھیں جائیں وہ راقم سطور کی طرف محول کی جائیں۔

راقم اپنے محسن و مربی عم محترم و معظم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کا ممنون ہے کہ مشغولیت کے باوجود حضرت نے بیش قیمت مقدمہ تحریر فرمایا، جس سے رسالہ کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا۔

اپنے ان دوستوں اور عزیزوں کا بھی شکریہ ادا کیا جاتا ہے جنھوں نے رسالہ کی اشاعت کے لیے محنت کی، خاص طور پر عزیزی مولوی محمد اسحٰق ندوی اور عزیزی مولوی محمد عمر عثمان ندوی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں بڑی دلچسپی سے پروف کی تصحیح اور تخریج کا کام پورا کیا اور عزیز القدر مولوی محمد نفیس خاں ندوی نے ہمیشہ کی طرح اس کی

طباعت واشاعت اپنے ذمہ لی۔

اللہ تعالیٰ سب کواس کے اجر میں شامل فرمائے اوراس رسالہ کومعاشرہ کی اصلاح کے لیے مفیداور نافع فرمائے۔آمین۔

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مرکز الامام ابی الحسن الندوی

دارعرفات، دائرہ شاہ علم اللہ، رائے بریلی

یکم ربیع الاول ۱۴۳۱ھ

اصلاح معاشرہ

اسلام نے انسان کو اجتماعی نظام سے جوڑا تھا لیکن مغرب نے فرد کی آزادی کا دلفریب نعرہ دے کر انسانوں کو خانوں میں بانٹ دیا، ایک انسان سے دوسرے انسان کا تعلق کاروبار بن کر رہ گیا، بعض سفر کرنے والوں نے بتایا کہ انگلینڈ میں جگہ جگہ بورڈ پر لکھا ہوا ملا کہ "Mind your own business" یعنی آپ اپنا کام کیجیے۔ کوئی کچھ بھی کرے چھپ کر کے یا علی الاعلان کرے، کسی کو بولنے کی گنجائش نہیں، اس لیے کہ یہ اس کی آزادی کے خلاف ہے، لیکن اسی پر ایک سوالیہ نشان لگ جاتا ہے کہ دیکھنے والا اگر کچھ کہنا چاہے تو اس پر بندش لگانا کیا آزادیِ رائے کے خلاف نہیں ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ سب خودساختہ اصطلاحات ہیں جن کے پردہ میں انسانوں کو جانوروں کی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دی جارہی ہے۔

ایک بڑے عالم کے پاس یورپ کی ایک تنظیم کے کچھ نمائندے آزادیِ رائے کے سلسلہ میں کچھ سوالات کرنے پہنچے، انھوں نے کہا کہ پہلے میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں کچھ حدود و قیود ہیں یا نہیں؟ جواب میں انھوں نے کہا کہ ہم تو اس میں کوئی قدغن لگانا نہیں چاہتے۔ مولانا نے کہا کہ اگر کوئی یہ رائے رکھتا ہے کہ دنیا بھر کے دولت مندوں کی دولت چھین کر غریبوں میں تقسیم کردینی چاہیے اور وہ اس کے لیے عملی اقدامات شروع کردے تو کیا اس پر کوئی پابندی لگائی جائے گی؟ اگر نہ لگائی جائے تو حالات بگڑتے جائیں گے اور اگر لگائی جائے تو یہ آزادیِ رائے کے خلاف ہے۔

اسلام نے بے شک آزادی کی اجازت دی ہے لیکن اس کے حدود متعین کیے ہیں، ایک آدمی کو کھانے کی اجازت ہے لیکن دوسروں سے چھین کر نہیں، ضرورت سے زیادہ نہیں، انسان اپنی جنسی خواہشات پوری کرسکتا ہے لیکن حدود میں رہ کر، اسلام

ہم جنسی کی اجازت نہیں دیتا، اور کوئی بھی معقول مذہب اور فلسفہ اس کی اجازت نہیں دے سکتا، ایک مرد صرف اسی عورت سے یہ تعلق رکھ سکتا ہے جس سے اس نے نکاح کیا ہو اور اس کی ذمہ داریاں اپنے ذمہ لی ہوں، اس کے علاوہ کسی غیر کی طرف غلط نگاہ ڈالنا بھی اسلام میں جرم ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ آج سماج کی خرابیاں اسی مطلق العنان آزادی کی دَین ہیں جس نے انسانوں کو جانور بنادیا ہے اور برائیاں فیشن بنتی جارہی ہیں اور آزادی کے نام پر ان پر دبیز پردے ڈال دیئے جاتے ہیں۔

سماج افراد سے بنتا ہے، اجتماعیت محبت وسلوک سے پیدا ہوتی ہے، افراد جب تک اپنے اندر محبت وایثار نہ پیدا کریں اس وقت تک اجتماعیت پنپ نہیں سکتی، اس میں صرف اپنی لذت، اپنی راحت، اپنی دولت کا فلسفہ چھوڑنا لازم ہے، سماج کی فکر، اس کو صحیح رُخ پر لانے کی ضرورت کا احساس اور انسانوں کو انسان بنانے کا جذبہ جب تک پیدا نہیں ہوگا، اور اس کے لیے اپنی لذت وراحت کو تج دینے اور ضرورت پڑ جائے تو اپنے فائدے سے دست بردار ہوجانے اور دوسروں کے لیے قربانی دینے کا عزم وحوصلہ جب تک پیدا نہیں ہوگا اور اس کے لیے ہر سماج میں کچھ افراد سر بہ کف کھڑے نہیں ہوجائیں گے اس وقت تک حالات میں تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔

حد سے زیادہ بڑھی ہوئی مال کی محبت، اسراف وفضول خرچی، نام ونمود کی حرص، بے حیائی، لذت اندوزی کے بے جا جذبات، یہ سب وہ برائیاں ہیں جنھوں نے آج پوری دنیا کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے، اور اس سے بڑھ کر خطرہ کی بات یہ ہے کہ برائیوں کو برائی کہنے والے ختم ہوتے جارہے ہیں اور اگر کوئی اچھی طبیعت رکھنے والا ہمت بھی کرتا ہے تو دس لوگ اس کی ہمت کو توڑنے کے لیے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

اسلام بھلائیوں کو بڑھاوا دیتا ہے، خیر کو پھیلاتا ہے اور خیر پھیلانے والوں کی ہمت افزائی کرتا ہے اور برائیوں پر روک لگاتا ہے، اس نے دنیا میں زندگی گزارنے کا ایک ایسا اجتماعی نظام پیش کیا ہے جس میں ہر طبقہ کے لیے بھلائی ہے، اقتصادی نظام سے لے کر معاشرتی اور اخلاقی نظام تک اس میں ایک طرف کچھ آزادی دی گئی ہے، دوسری طرف ایسے حدود متعین کیے گئے ہیں کہ انسان انسانیت کا بھرم قائم رکھے، اپنے اخلاق و کردار میں وہ ایسا نمونہ پیش کرے جس سے یہ معلوم ہو کہ اس کی سوچ کچھ اور ہے، اور اس کے لیے یہ دنیا ہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ وہ ایک دوسری زندگی کو سامنے رکھ کر جیتا ہے، زندگی کی لگام اس کے ہاتھ میں ہے، خواہشات اس کو نہیں چلاتیں بلکہ وہ خواہشات کو چلانا جانتا ہے اور ان کو کنٹرول میں رکھتا ہے، اس کی حیثیت حاکم کی ہے محکوم کی نہیں، وہ اپنے نفس کا غلام نہیں ہے بلکہ نفس کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے۔

اجتماعی زندگی کے اصول جب بھی بنائے جائیں گے اس میں ہر ایک کا خیال رکھنا ہوگا، ہر طبقہ کو اس کا حق دینا ہوگا، غریبوں کے حقوق، مالداروں کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق، غیروں کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، کچھ وقت ساتھ گزارنے والوں کے حقوق، سب کے اپنے اپنے خانے ہیں اور ہر ایک کو اس کی جگہ رکھنا اور توازن کو بگڑنے نہ دینا اسلام کی تعلیم ہے۔

ہر ایک کی اپنی جگہ ہے، اس کو اس کی جگہ اعتدال کے ساتھ قائم رکھنا سماج کے لیے ضروری ہے، لیکن انسانی عقل نے جب بھی اس کا نظام خود طے کیا ہے وہ افراط و تفریط کا شکار ہوئی ہے، ہر عقل کا ایک سانچہ ہوتا ہے جس میں وہ پروان چڑھتی ہے اور ڈھلتی ہے، اس پر ماحول کے بھی اثرات پڑتے ہیں اور تربیت کرنے والوں کے بھی، نظام تعلیم کے بھی اور آس پاس پنپنے والی فکری آراء کے بھی، عقل اپنے اسی

ڈھلے ڈھلائے سانچے سے سوچتی ہے اور فیصلہ کرتی ہے، اس کے نتیجہ میں اس کے اندر جھکاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ توازن قائم نہیں رکھ پاتی، اس لیے سماجی نظام کو توازن کے ساتھ باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسانوں کے پیدا کرنے والے نے انسانوں کے لیے جو اجتماعی نظام تجویز کیا ہے اور اپنے پیغمبروں کے ذریعہ وہ دنیا کے انسانوں تک پہنچایا ہے اس کا کھلے دل سے مطالعہ کیا جائے اور اس کی روشنی میں پورا نظام طے کیا جائے، وہ نظام خدا کی آخری کتاب قرآن مجید میں موجود ہے، اور آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مزید وضاحت اور تفصیل کے ساتھ انسانوں کے سامنے پیش کیا ہے اور ایک ایک چیز کی وضاحت کی ہے۔

اس میں سب سے بڑی ذمہ داری مسلمانوں پر ہے، ان کے پاس نظام ہے، اور مسلمانوں کی پوری تاریخ ہے کہ ہر دور میں اصلاح کرنے والے اور برائیوں پر نکیر کرنے والے پیدا ہوتے رہے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے پاس کتاب الٰہی اور شریعت مصطفوی ہے، دوسری قوموں کی تاریخ پڑھ جایئے، صدیوں میں کوئی مصلح نظر آتا ہے، اور اس کی تعلیمات کا بھی اگر جائزہ لیا جائے تو صرف چند ہی چیزوں پر اس کے یہاں زور ملتا ہے، لیکن سماج کا نقشہ کیا ہونا چاہیے اور اس کی کیا بنیادیں ہیں اس کی تفصیلات پیش کرنے سے وہ عاجز ہیں۔

اس وقت دنیا دوراہے پر کھڑی ہے، اسلام کا پیش کیا ہوا سماجی نظام ہی تنہا وہ متوازن، جامع اور مکمل نظام ہے جو بگڑتے حالات کو سنبھال سکتا ہے، لیکن آج ان لوگوں کی بڑی تعداد ہے جو اس پر غور کرنے کو تیار نہیں، اور خود مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اس نظام کے صحیح نمائندے نہیں، ان کے حالات کو دیکھ کر اسلام کی جو تصویر اُبھر کر لوگوں کے سامنے آتی ہے وہ نہایت ناقص تصویر ہے، اس وقت ایک طرف مسلمانوں کی بڑی ذمہ داری ہے، مسلمانوں نے اگر صحیح نظام نہ پیش کیا، اسلام کی صحیح

ترجمانی نہ کی اور خود بھی وقت کے دھارے میں بہتے رہے تو دنیا کی تباہی میں وہ بھی مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے نظر آئیں گے، اور دوسری طرف دنیا کے ہوش رکھنے والوں اور سمجھ بوجھ رکھنے والوں کی بھی ذمہ داری ہے، وہ دنیا کے مختلف نظاموں کا تجربہ کر چکے، یہودیوں نے تو پہلے ہی دم توڑ دیا، اور وہ بجائے انسانیت کی رکھوالی کے اس کے قاتل بن گئے، عیسائیت بھی دنیا کو کوئی صاف اور بے خطر راستہ نہ دے سکی، اس کی مذہبی کتابوں میں وہ ہدایت موجود بھی نہیں ہیں بقول کسی عیسائی مفکر کے: ''حضرت عیسیٰ اگر یکجا کی جائیں تو اخبار کے ڈیڑھ کالم سے نہیں بڑھ سکیں گی۔'' اس صورت حال میں ڈوبتی دنیا کو اگر سہارا مل سکتا ہے تو صرف اسلام سے! دنیا اس کا تجربہ کر چکی ہے، حضرات خلفائے راشدین کے دور میں جب پورے اسلام پر عمل تھا، دنیا نے امن واطمینان اور راحت وسکون کی صدیوں کے بعد سانس لی تھی، اور پھر عرصہ تک اس کی ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہیں، ایک عورت بے خوف وخطر ایک شہر سے دوسرے شہر چلی جاتی، کسی کے لیے چوں چرا کی گنجائش نہیں تھی، پھر جب مسلمانوں نے اسلام کو چھوڑا تو حالات کچھ کے کچھ ہو گئے۔

آج دنیا کو دوبارہ پلٹنے کی ضرورت ہے، جو تجربہ ہو چکا اگر وہ دہرا دیا جائے تو شاید حالات پھر بدل جائیں، لیکن اس کے لیے آسمانی تعلیمات کا سہارا لینے کی ضرورت ہے، قرآن مجید جس کو لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا، اس کی روشنی میں آنے کی ضرورت ہے۔

قرآن مجید کی تعلیمات

قرآن مجید اللہ کی آخری کتاب ہے، جس کو اللہ نے دنیا میں بسنے والے تمام انسانوں کے لیے اپنے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا ہے، اس کو ”ھدی للناس“ بھی کہا گیا ہے، تمام لوگوں کے لیے وہ ایسا راستہ ہے جو اس کو اختیار کرے گا وہ دنیا وآخرت کی زندگی میں اپنی مراد کو پائے گا، اس کو اختیار کرنے والے متقی پرہیزگار کہلاتے ہیں، ان کی زندگی پاکیزہ اور محتاط ہوتی ہے، وہ ہمہ وقت اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں، گویا کہ اس سے فائدہ اٹھانے والے متقی ہوتے ہیں اور عملاً ایسے ہی لوگوں کو اس سے راستہ ملتا ہے اسی لیے دوسری جگہ اس کو ”هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ“ یعنی متقیوں کے لیے ہدایت کہا گیا ہے۔

قرآن مجید کی سب سے پہلی دعوت توحید کی ہے، ہر ہر زمانے میں اللہ نے اپنے پیغمبروں کو اسی کے لیے بھیجا، ہر ایک کی دعوت یہی تھی ﴿يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ﴾ (۱) (اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں)، قرآن مجید کی بیشتر آیتوں میں اللہ کی وحدانیت کو صاف صاف بیان کیا گیا ہے، مثالوں سے اس کی ربوبیت کو بتایا گیا ہے، اللہ کی ذات اور اس کی صفات میں شرک کی جگہ جگہ مذمت کی گئی ہے اور صاف صاف کہہ دیا گیا ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ﴾ (۲) (اللہ اس کو نہیں معاف کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے علاوہ جسے چاہے گا معاف کرے گا)، جو بھی قرآن مجید میں غور وتدبر سے کام لے گا یا صرف کسی سمجھنے ہی کی کوشش کرے گا، اس کے دل میں شرک سے نفرت بیٹھ جائے گی، قرآن مجید کے ایک بڑے عالم نے یہ بات لکھی ہے: ”قرآن مجید کا پڑھنے والا سب کچھ ہوسکتا ہے مگر مشرک نہیں“۔(۱)

اصلاح عقیدہ کے بعد جس چیز پر قرآن مجید میں سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ اصلاح معاشرہ ہے، سماجی اور اخلاقی برائیوں کو دور کرنے کی جگہ جگہ تلقین کی گئی ہے، انفرادی اور اجتماعی حقوق و معاملات کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام میں بعضوں کی بعثت کے مقاصد میں اخلاق و معاملات کی خرابیاں دور کرنے کا تذکرہ ملتا ہے۔

حضرت شعیبؑ کی قوم معاملات کی خرابیوں میں حد سے آگے بڑھ گئی تھی، ناپ تول میں کمی کرنا اور ڈنڈی مارنا ان کا شیوہ بن گیا تھا، حضرت شعیبؑ اسی لیے بھیجے گئے کہ وہ دعوت توحید کے ساتھ ان کی اس بدمعاملگی کو دور فرمائیں، چنانچہ اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے وہ اس کا تذکرہ فرماتے ہیں:

﴿يَـٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلٰهٍ غَيْرُهُ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ إِنِّي أَرَاكُمْ بِخَيْرٍ وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ﴾ (۲)

(اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور ناپ تول میں کمی مت کرو، میں تمہیں مزے میں دیکھ رہا ہوں، اور مجھے تم پر اس دن کے عذاب کا اندیشہ ہے جو گھیر لینے والا ہے)۔

حضرت لوطؑ کی قوم بے حیائی اور بدفعلی میں مبتلا تھی، حضرت لوطؑ کو اسی لیے بھیجا گیا کہ وہ ان کو تنبیہ کریں اور اس گندگی سے ان کو نکالنے کی کوشش فرمائیں، اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے جگہ جگہ وہ ان کی اس خباثت کا تذکرہ فرماتے ہیں:

﴿أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ﴾ (۱)

(کیا دنیا جہاں میں تم مردوں سے خواہش پوری کرتے ہو اور تمہارے رب نے جو بیویاں بنائی ہے ان کو تم نے چھوڑ رکھا ہے البتہ تم حد سے تجاوز کرنے والے لوگ ہو)۔

موجودہ سماج میں بھی یہ دو برائیاں ایسی ہیں جو ہزار خرابیوں کی بنیاد ہیں، ایک مال کی حد سے بڑھی ہوئی محبت اور دوسرے بے حیائی۔ رشوت، سود، جھوٹ، وعدہ خلافی، بدعہدی، مال کی بے جا تقسیم، حق تلفی، قتل و غارت گری اور نہ جانے کتنے جراثیم ہیں جن کے پیچھے ان ہی دو خرابیوں کا ہاتھ ہے، جب مال کی محبت حد سے بڑھ جاتی ہے تو دوسروں کے حقوق فراموش ہو جاتے ہیں اور انسان مال حاصل کرنے اور اس کو جمع کرنے کی ہر جائز ناجائز تدبیر کرتا ہے، وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ اس کو مرنا ہے، اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے، اس کی پوری زندگی اسی ادھیڑ بن میں گزرتی ہے کہ کس طرح دولت بڑھائی جائے پھر وہ اس حد تک گر جاتا ہے کہ خود چند ٹکوں کے حصوں کے لیے دوسروں کا بڑے سے بڑا نقصان کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، اس کا ضمیر ملامت کرنا چھوڑ دیتا ہے اور مال و دولت کے دلدل میں وہ دھنستا چلا جاتا ہے۔

اسی طرح دوسری برائی بے حیائی ہے، یہ بھی ایسا خطرناک مرض ہے کہ انسان اس کے لیے سب کچھ بھلا دیتا ہے، یہاں تک کہ نہ اس کو اپنی عزت کا خیال رہ جاتا ہے اور نہ نسل انسانی کے تحفظ کا، وہ تھوڑی دیر کے مزہ کے لیے اپنا سب کچھ داؤں پر چڑھا دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

یہ دونوں خرابیاں سماج میں بڑھتی چلی جاری ہیں اور اس میں بڑا ہاتھ مغربی تہذیب کا ہے، جس نے انسان کو بالکل جانوروں کی سی آزادی دے دی ہے، ایک شریف انسان جن چیزوں کا پہلے تصور نہیں کرسکتا تھا آج وہ چیزیں برسر بازار ہو رہی ہیں اور ان کو ترقی کی علامت سمجھا جانے لگا ہے اور ثقافت کا ایک حصہ قرار دے دیا گیا ہے۔

اسلام نے اس زیادتی پر زبردست نکیر کی ہے، اس کے حدود و قیود متعین کیے ہیں، جنسی خواہش کی تکمیل سے اسلام نہیں روکتا لیکن اس کے لیے نکاح کی شرط لگاتا ہے تاکہ اعتدال قائم رہے اور نسل انسانی کو گھن نہ لگ جائے، قرآن مجید میں کامیابی حاصل کرنے والوں کی صفات میں اس کا تذکرہ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُوْلٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ﴾ (۱)

(جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، بجز اپنی بیویوں کے اور اپنی باندیوں کے تو وہاں وہ ملامت کے مستحق نہیں اور جس نے اس سے آگے کچھ خواہش کی تو ایسے ہی لوگ حد سے آگے بڑھ جانے والے ہیں)۔

زنا کی شدت کا بیان ان الفاظ میں ہے:

﴿وَلَا تَقْرَبُوْا الزِّنٰىٓ إِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتاً وَّسَآءَ سَبِيْلاً﴾ (۲)

(اور زنا کے قریب بھی مت جانا وہ تو بڑی بے حیائی ہے اور بدترین راستہ ہے (اپنی خواہش کی تکمیل کا)۔

بے حیائی کو عام کرنے والوں پر بھی سخت نکیر کی گئی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ أَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ﴾ (۱)

(جو لوگ اہل ایمان میں بے حیائی پھیلانا چاہتے ہیں ان کے لیے دنیا و آخرت میں اذیت ناک عذاب ہے)۔

اسی لیے زنا کی تہمت لگانے والے کو کوڑے مارنے کا حکم ہے۔

جنسی خواہش ہر ایک میں ہوتی ہے، اس کو ختم کر دینے سے بھی منع کیا گیا ہے، بعض صحابہ نے اس کی اجازت چاہی تھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا، البتہ فرمایا کہ ایسے شخص کو نکاح کر لینا چاہیے اور اگر نکاح پر قدرت نہ ہو تو روزوں کی کثرت اس کے لیے مفید ہے اس سے یہ خواہش کم ہو جاتی ہے اور نفس پر قابو پانا آسان ہو جاتا ہے۔

اسی طرح اسلام مال کی محبت سے روکتا ہے اس میں غلو اور انتہا پسندی پر قدغن لگاتا ہے، نہ وہ بقدر ضرورت مال کو رکھنے سے روکتا ہے، اور نہ مطلق جمع کرنے سے منع کرتا ہے اگر اس کے حق کی ادائیگی ہوتی رہے، اللہ کے راستہ میں خرچ کیا جاتا رہے، سینت سینت رکھنے والوں اور خرچ نہ کرنے والوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ﴾ (۱)

(جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کے راستہ میں اس کو خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری دے دیجیے جس دن اس کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی، یہی وہ ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کر کے رکھا تھا، بس جو تم نے جمع کیا تھا اس کا مزہ چکھو)۔

خرچ کرنے والوں کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں

تک ارشاد فرمایا:

”لا حسـد إلا في إثنتين رجل آتاه اللّٰه مالا، فسلطهٗ على هـلكته في الحق، ورجل آتاه اللّٰه حكمة فهو يقضى بها ويعلمها.“(۲)

(دو طرح کے لوگ قابل رشک ہیں، ایک وہ جس کو اللہ نے مال دیا ہو اور صحیح جگہ خرچ کرنے پر اس کو لگا دیا ہو، دوسرے وہ شخص جس کو اللہ نے حکمت و دانائی دی ہو تو وہ اس کے ذریعہ فیصلہ کرتا ہو اور اس کی تعلیم دیتا ہو)۔

سماج کی اور خرابیوں کو بھی مختلف آیات میں واضح کیا گیا ہے اور ان سے بچنے کی تلقین کی گئی، ایک دوسرے کے حقوق بتائے گئے ہیں اور ان کا خیال رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، ان میں سب سے بڑا حق ماں باپ کا بتایا گیا ہے، مخصوص مقامات پر اللہ جل شانہ نے اپنے حق کے ساتھ والدین کے حق کا تذکرہ فرمایا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ﴾(۱)

(میرے احسان مند ہو اور اپنے ماں باپ کے اور میری طرف لوٹ کر آنا ہے)۔

آگے فرمایا جا رہا ہے:

﴿وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَى أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفاً﴾(۲)

(اور اگر وہ تمہیں اس پر مجبور کریں کہ تم میرے ساتھ شریک کرو جس کے بارے میں تم علم نہیں رکھتے تو ان کی بات مت ماننا اور دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی کرتے رہنا)۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضرت اسماء بنت صدیقؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میری والدہ مشرکہ ہیں وہ چاہتی ہیں کہ میں ان کے ساتھ سلوک کروں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں ان کے ساتھ سلوک کرتی رہو۔

شرک جیسی مبغوض ترین چیز کے باوجود دنیا میں ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے اوران کی خدمت کرنے کی جو تلقین کی جارہی ہے اس سے ہمیں اس کی اہمیت معلوم ہوتی ہے، مغربی تہذیب نے ماں باپ کے تعلق کو بھی جس طرح تار تار کر دیا ہے وہ اس کے خاص تاجرانہ ذہن کا نتیجہ ہے۔ امریکہ میں رہنے والے ایک صاحب نے اپنا واقعہ سنایا کہ جب میری اہلیہ ڈلیوری (Delivery) کے سلسلہ میں ڈاکٹر کے یہاں گئیں تو اس نے پہلا سوال یہ کیا کہ آپ شادی شدہ ہیں؟ پھر جب بچہ کی ولادت ہوئی تو اس نے سوال کیا کہ کیا آپ بچہ کو لے جائیں گی؟ ایک ڈیڑھ سال بعد جب دوبارہ ضرورت پڑی تو اس نے گھور کر دیکھا۔

اس پوری گفتگو سے مغربی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے کہ اول تو حفاظت نسب کا تصور ہی وہاں مٹ کر رہ گیا ہے۔ دوسری بات جو سامنے آئی ہے اس سے ان کی شقاوت قلبی کا پتہ چلتا ہے کہ بچہ کی ولادت ہونے کے بعد بھی ماں کو بچہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اسی لیے عام طور پر لوگ بچوں کو اسپتال میں چھوڑ کر فارغ ہوجاتے ہیں۔ تیسرے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایک کے بعد دوسرے بچے ان کے یہاں ایک عجوبہ کی چیز ہے، اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ حساب لگاتے ہیں کہ بچہ ہوگا تو اتنے ہزار ڈالر خرچ ہوں گے، اس کی تعلیم پر اتنے لاکھ ڈالر خرچ آئے گا اور جب وہ کسی قابل ہوگا تو وہ الگ ہوجائے گا اور بوڑھے ماں باپ کا سہارا بننے کے بجائے ان کو بوڑھوں کے گھر (Old House) میں لے جاکر ڈال دے گا۔

اس ذہنیت نے ماں باپ کے پاکیزہ رشتوں میں بھی ایسی دراریں ڈال

دی ہیں کہ پورا نظام کرپٹ (Corrupt) ہو کر رہ گیا ہے۔

قرآن مجید اس تاجرانہ ذہنیت کی نفی کرتا ہے، اور ماں باپ کے رشتہ کو بڑی اہمیت سے بیاں کرتا ہے، اور یہ حکم دیتا ہے کہ خواہ دنیا کے اعتبار سے بے فائدہ ہو کر رہ جائیں لیکن ان کی خدمت سعادت اخروی کا راستہ ہے، جنت کو ماں کے قدموں کے نیچے بتایا گیا ہے اور باپ کو جنت کا قیمتی دروازہ کہا گیا ہے اور یہاں تک ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَإِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾ (۱)

(تمہارے پاس اگر دونوں یا دونوں میں سے ایک بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے اف بھی مت کرنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان دونوں سے نرم بات کرنا، اور ان کے لیے محبت و رحمت کے ساتھ سراپا تواضع بن جانا اور کہنا کہ اے رب ان دونوں پر رحم فرما جس طرح انھوں نے بچپن میں مجھے پالا پوسا)۔

عظمت انسانیت قرآن مجید کا ایک اہم موضوع ہے: "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ" (اور ہم نے بنو آدم کو عزت دی ہے) کہہ کر خالق کائنات نے عظمت کا تاج انسان کے سر پر رکھا ہے، لیکن خود انسان کو احترام انسانیت کی تلقین فرمائی ہے اور یہاں تک فرما دیا گیا:

﴿مَن قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا﴾ (۱)

(جس نے کسی کی جان کو بغیر کسی جان کے یا بغیر زمین میں بگاڑ

کے قتل کر دیا گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے اس کی زندگی رکھی تو گویا اس نے تمام لوگوں کو زندگی دی)۔

زمانہ جاہلیت میں عورت سر بازار رسوائی تھی، اس کی قیمت جانور سے زیادہ نہ تھی، صرف عربوں ہی میں نہیں بلکہ اس وقت کی بڑی بڑی حکومتوں میں اس کو صرف ضرورت پوری کرنے کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا، اسی لیے اگر لڑکی پیدا ہو جاتی تو سر شرم سے جھک جاتے اور کتنے درندہ صفت لوگ اس معصوم کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر دینے کو باعث فخر جانتے تھے، قرآن مجید نے ان کی اس درندگی کی جڑ کاٹ دی، ارشاد فرمایا:

﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ﴾ (۱)

(اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ گھونٹ جاتا ہے، اس بری خوشخبری کی وجہ سے وہ لوگوں سے منہ چھپائے پھرتا ہے، ذلت کے ساتھ اس کو مرنے دے یا مٹی میں داب آئے، خوب سن لو کیسے بدترین فیصلے وہ کیا کرتے تھے)۔

سورۂ لقمان میں حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو جو نصیحت فرمائی ہے قرآن مجید میں اس کو نقل کر کے تمام مسلمانوں کے لیے نصیحت کی چیز بتا دیا گیا ہے، اس میں خاص طور پر یہ تین آیتیں اپنے اندر بیش بہا خزانہ رکھتی ہیں اور ان میں سماج کی اصلاح کے لیے کیسے بینادی اصول بتا دیے گئے ہیں:

﴿يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ وَلَا تُصَعِّرْ

خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحاً إِنَّ اللّٰه لَايُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ﴾(۲)

(اے میرے بیٹے! نماز قائم رکھو، بھلائی کی تلقین کرتے رہو اور برائی سے روکتے رہو اور تمہیں جو تکلیف پہنچے اس پر صبر کرتے رہو، یقیناً یہ بڑی عزیمت کے کام ہیں، اور لوگوں کے لیے گال مت پھلاؤ اور زمین میں اکڑ کر مت چلو، یقیناً اللہ کسی اکڑنے والے، تکبر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا، اور درمیانی چال چلو اور آواز دھیمی رکھو یقیناً کریہہ ترین آواز گدھے کی آواز ہے)۔

اسی طرح سورۂ فرقان میں ”عِبَادُ الرَّحْمٰنِ“ (اللہ کے خاص بندوں) کی جن صفات کا تذکرہ ہے وہ ہر مومن کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہیں، اللہ کا جو بندہ بھی ان اعلیٰ صفات کو اختیار کرے گا وہ رحمت الٰہی کا خاص طور پر مستحق ہوگا، اور اللہ کے ساتھ اس کو خاص نسبت حاصل ہو جائے گی:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْناً وَّإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰماً☆ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّداً وَّقِيَاماً☆ وَّالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَاماً☆ إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرّاً وَّمُقَاماً☆ وَّالَّذِيْنَ إِذَآ أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَاماً☆ وَّالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهاً آخَرَ وَلَايَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ أَثَاماً☆ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

وَيَخْلُدُ فِيهِ مُهَاناً ☆ إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً فَأُولَئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَّكَانَ اللّٰهُ غَفُوراً رَّحِيماً ☆ وَّمَنْ تَابَ وَعَمِلَ عَمَلاً صَالِحاً فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللّٰهِ مَتَاباً ☆ وَّالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَاماً ☆ وَّالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمّاً وَّعُمْيَاناً ☆ وَّالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَاماً ☆ أُولَئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَّسَلَاماً ☆ خٰلِدِينَ فِيهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرّاً وَّمُقَاماً ☆ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَاماً ☆﴾(۱)

(اور رحمٰن کے خاص بندے وہ ہیں جو زمین پر تواضع کے ساتھ چلتے ہیں اور جب نادان لوگ ان کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں، تو وہ سلام کہہ کر گزر جاتے ہیں ☆ اور جو اپنے رب کے لیے سجدے کرتے اور قیام میں رات بتا دیتے ہیں ☆ اور جو یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب جہنم کے عذاب کو ہم سے پھیر دیجیے یقیناً اس کا عذاب بڑی سزا ہے ☆ بلا شبہ وہ نہایت بری جائے قرار اور جائے مقام ہے ☆ اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ زیادتی کرتے ہیں نہ کمی اور وہ اعتدال پر قائم رہتے ہیں ☆ اور جو اللہ کے ساتھ اور کسی معبود کو نہیں پکارتے اور کسی ایسی جان کو جسے اللہ نے حرام کر دیا ہو ناحق قتل نہیں کرتے اور زنا نہیں کرتے اور جو ایسا کرے گا وہ بڑے گناہ میں پڑے گا ☆ قیامت کے دن اس

کا عذاب دوگنا کردیا جائے گا اور ہمیشہ اسی میں ذلیل ہوکر رہے گا☆ہاں جو توبہ کرلے اور ایمان لے آئے اور اچھے کام کرے، تو ایسوں کی برائیوں کو اللہ نیکیوں سے بدل دیتا ہے، اور اور بڑی مغفرت کرنے والا نہایت رحم فرمانے والا ہے☆اور جو رجوع کرے اور اچھے کام کرے تو وہ یقیناً اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہے☆اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب لغو کے پاس گزرتے ہیں تو شریفانہ گزرجاتے ہیں☆اور جب ان کے رب کی آیتوں سے ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو ان پر بہرے اور اندھے ہوکر نہیں گر پڑتے☆ اور جو یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہماری بیبیوں کو اور ہماری اولاد کو ہمارے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دیجیے اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا کر دیجیے☆ایسوں ہی کو بدلہ میں بالا خانے دیے جائیں گے ان کے صبر کے عوض میں اور اس میں ان کو سلام و دعا کے نذرانے پیش کیے جائیں گے☆اسی میں ہمیشہ رہیں گے، وہ کیا خوب جائے قرار اور جائے مقام ہے☆آپ کہہ دیجیے کہ اگر ہماری عبادت نہ ہوئی تو تمہارے رب کو تمہاری کوئی پرواہ نہ ہوتی تو تم جھٹلا بھی دیتے تو وہ (عذاب) چمٹ ہی جاتا☆)۔

قرآن مجید کی سورتوں میں جو سورت اصلاح معاشرہ کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے وہ سورہ حجرات ہے، اس میں سماج کی برائیوں کا تذکرہ بھی ہے اور ان کا علاج بھی، رب العالمین نے جو انسان کا بھی خالق ہے اور اس کی نفسیات کا بھی خالق و مالک ہے اس میں اس نے انسان کی بنیادی کمزوریوں کو بیان فرمادیا ہے۔

اصلاح معاشرہ کے بنیادی اصول
سورۂ حجرات کی روشنی میں

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے، اس کا لفظ لفظ اعجاز سے بھرا ہوا ہے، دنیا میں بسنے والے ہر ہر انسان کو اس میں خطاب کیا گیا ہے اور ہر ایک کی ذہنی سطح کا اس میں خیال رکھا گیا ہے، اس کی مختلف آیتوں اور مختلف سورتوں میں انسان کی رہنمائی کا پورا سامان موجود ہے، اس کے کسی گوشہ کو تشنہ نہیں چھوڑا گیا، کوئی بھی اگر کھلے دل سے اس کا مطالعہ کرتا ہے تو خواہ وہ ہدایت سے کتنا ہی دور ہو، حقائق اس کے سامنے کھلنے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ وہ اپنے پیدا کرنے والے سے قریب ہوتا جاتا ہے، اس کی تلاوت قربِ الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اس میں زندگی کا جو دستور دیا گیا ہے وہ پوری دنیا کے لیے سلامتی اور ترقی کا ضامن ہے، سماجی واخلاقی نظام جو اس میں بنایا گیا ہے وہ کسی بھی سماج کے لیے منارہ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔

سورۂ حجرات جو صرف اٹھارہ آیتوں پر مشتمل ہے، سماج کے لیے ایک عظیم رہبر سورہ ہے، جس میں عقیدہ واخلاق کی تعلیمات کے ساتھ انسانی حقائق کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ عقل پر سے پردے ہٹتے چلتے جاتے اور ایسے ایسے آفاق سامنے آتے ہیں جن کی طرف انسانی عقل کی رسائی بغیر رہبری کے ممکن نہیں تھی، اس میں دل کی غذا اور روح کی شفا کا ایسا سامان موجود ہے کہ اگر اس کو اختیار کرلیا جائے تو سکون و اطمینان کی حقیقی دولت انسان کو نصیب ہوتی ہے۔

اس میں دنیا کے قیام و بقا اور صلاح کے بنیادی اصول بیان کیے گئے ہیں اور اس پھر اس کو باقی رکھنے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے اور ایسے صاف ستھرے سماج کی تشکیل کی

گئی ہے جو اشرف المخلوقات کے لیے ضروری ہے اور اس پر اس کی کامیابی کا انحصار ہے۔

سورۂ شریفہ کا آغاز اس بنیادی عقیدہ پر کیا گیا ہے جس پر ہر خیر کی عمارت تعمیر ہوتی ہے، بندہ کا اپنے رب سے کیا تعلق ہونا چاہیے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت کیسی ہونی چاہیے، جب تک اس میں استحکام نہ ہو، اگلے سب احکامات تقریباً بے سود ہیں۔

اللہ کا سچا مومن بندہ کسی بھی کام میں جب تک حکم الٰہی نہ معلوم ہو آگے نہیں بڑھتا، اللہ کے سامنے اور اس کے رسول کے سامنے خود اس کی کوئی رائے نہیں ہوتی بلکہ وہ ہر حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حق کے بعد ایک دوسرے کے حقوق اور معاملات اور معاشرت کے آداب بیان کیے گئے ہیں، کسی کے بارے میں سنی سنائی باتوں پر یقین نہ کیا جائے، فیصلہ بغیر تحقیق کے نہ ہو، جب تک پورا اطمینان نہ ہو کوئی غلط رائے قائم نہ کی جائے۔

سرشت انسانی دیکھ کر فرشتوں نے کہا تھا کہ یہ تو زمین میں بگاڑ کرنے والے اور خون بہانے والے لوگ ہیں، آپس کی لڑائیاں اور جھگڑے انسانی مزاج میں داخل ہے، اسی لیے صلح صفائی کرادینے کو اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اور بار بار یہ کہا گیا کہ اہل ایمان ایک دوسرے سے ایسا تعلق رکھتے ہیں جیسے ایک ہی جسم ہو، ان کو بھائیوں کی طرح مل جل کر رہنا چاہیے، پھر ان امراض کا بیان کیا گیا ہے جن کی جڑیں بڑی گہری ہوتی ہیں اور وہ سماج کو کھوکھلا کر کے رکھ دیتی ہیں جیسے ایک دوسرے کا مذاق اڑانا، برے ناموں سے پکارنا، بدگمانی کرنا، ٹوہ میں رہنا، غیبت کرنا، دوسروں کے معاملات میں ناحق مداخلت کرنا۔

عام طور پر چونکہ یہ باتیں خود پسندی سے پیدا ہوتی ہیں اس لیے یہ بات بھی

صاف کردی گئی کہ سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، کسی کو کسی دوسرے پر کوئی امتیاز حاصل نہیں، اگر امتیاز ہے تو صرف تقویٰ کی بنا پر، اور تقویٰ خود پسندی پر کاری ضرب لگاتا ہے۔

اخیر میں یہ بات بھی وضاحت کے ساتھ بیان کردی گئی کہ انسان کا خود اپنے بارے میں ایمان اور تقویٰ کا دعویٰ کرنا کافی نہیں، اس کے لیے دلیل چاہیے اور وہ دلیل ایسا یقین ہے کہ اس کے بعد پھر جان و مال کی قربانی آسان ہوجائے، یہ سچائی کی علامت ہے، اور اگر اللہ نے کسی کو توفیق عطا فرمادی ہے تو اس کو اللہ کا شکر کرنا چاہیے، اس میں کسی کی شان کو کوئی دخل نہیں، جو ملتا ہے محض اللہ کے فضل سے اور توفیق سے ملتا ہے، اور یہ سب کچھ دل کی گہرائیوں سے ہونا چاہیے، جو صورت حقیقت سے خالی ہو وہ اللہ کے یہاں مقبول نہیں، اور اللہ زمین و آسمان کے ڈھکے چھپے سے بھی واقف اور اندر باہر کے سب کاموں سے بھی واقف ہے۔

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَيُطَانِ الرَّجِيُمِ

بِسُمِ اللّٰهِ الرَّحُمٰنِ الرَّحِيُمِ

﴿يَـآ أَيُّهَـا الَّـذِيُنَ آمَنُوُا لَا تُقَدِّمُوُا بَيُنَ يَدَىِ اللّٰهِ وَرَسُوُلِهٖ وَاتَّقُوُا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيُعٌ عَلِيُمٌ ☆ يٰـآ أَيُّهَا الَّذِيُنَ آمَنُوُا لَا تَرُفَعُوُآ أَصُوَاتَكُمُ فَوُقَ صَوُتِ الـنَّبِـىِّ وَلَا تَجُهَرُوُا لَهٗ بِالُقَوُلِ كَجَهُرِ بَـعُـضِكُمُ لِبَعُضٍ أَنُ تَحُبَطَ أَعُمَـالُـكُمُ وَأَنُتُـمُ لَا تَشُعُرُوُنَ ☆﴾

''اللہ کے نام سے جو بہت مہربان، نہایت رحم فرمانے والا ہے۔

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت ہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بلاشبہ اللہ خوب سنتا، خوب جانتا ہے۔

اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی کی آواز پر بلند مت کرو، اور جس طرح تم ایک دوسرے کو زور زور سے پکارتے ہو اس طرح نبی کو زور سے مت پکارو کہ کہیں تمہارے سب کام بیکار چلے جائیں اور تمہیں احساس بھی نہ ہو۔''

عظمتِ رسالت

فلسفہ کی تاریخ

انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ دوسروں کی نقل اتارتا ہے، کبھی اپنے باپ دادا کے طور طریق اختیار کرتا ہے کبھی کسی غیر سے متاثر ہو کر اس کو اپنا مطاع بنا لیتا ہے، فلسفوں کی تاریخ بھی یہی رہی ہے، بڑے سے بڑا فلسفی، مفکر جب کوئی فلسفہ یا فکر پیش کرتا ہے تو اس کے سامنے بھی چند مثالیں ہوتی ہیں، ان کو وہ ایک نئے سانچے میں ڈھال کر اس طرح پیش کر دیتا ہے کہ وہ بالکل نئی چیز نظر آتی ہے، اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو سوائے نئے سانچے کے اس میں کوئی نئی بات ملنی مشکل ہے۔

اجزاء کی نئی ترتیب جب قائم کی جاتی ہے تو بات کبھی بگڑتی ہے اور کبھی بنتی ہے، یورپ کے فکر و فلسفہ کا بھی یہی حال ہے، ان سے کہیں سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے اور کہیں نئی ترتیب قائم کرنے میں، اگر کھلے دل سے غور کیا جائے اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا جائے تو تقریباً تمام فلسفوں اور افکار کے پس منظر میں اسلامی فکر و فلسفہ نظر آتا ہے، لیکن زیادہ تر یہ استفادہ منفی ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر ان مفکرین نے اسلام کے مطالعہ سے پہلے ہی ایک مفروضہ قائم کر رکھا ہے جو اسلام کی بالکل غلط تصویر پیش کرتا ہے، عام انسانیت کے لیے یہ ایک ناسور سے کم نہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ سائنسی اکتشافات اور جدید تحقیقات اکثر و بیشتر مفید ہونے کے بجائے نقصان دہ ثابت ہو رہی ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ اسلام نے قوت و اخلاق میں توازن کو قائم رکھا تھا، جہاں ایک طرف اسلام قوت و شوکت بڑھانے کی تعلیم دیتا ہے وہیں اس طاقت کے استعمال کا طریقہ بھی بتاتا ہے، عدل و انصاف سکھاتا ہے، حدود و قیود متعین کرتا ہے، جہاں وہ علم

وہنر میں انسان کو بلندیوں تک پہنچاتا ہے، وہیں اس کی تعلیم یہی ہے کہ وہ علم اللہ کے نام کے ساتھ جڑا رہے تاکہ وہ انسانیت کے لیے رحمت وبرکت بن سکے، یہ وہ پیغمبرانہ تعلیم ہے جو اسلام نے پیش کی ہے، آج دنیا نے اس کو فراموش کردیا، واقعہ یہ ہے کہ اس باب میں بھی سب سے اونچا نمونہ پیغمبروں کا ہے جن کا براہ راست رابطہ خالق کائنات سے ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے ان برگزیدہ بندوں کا انتخاب اسی لیے فرمایا کہ وہ عالم انسانیت کی رہنمائی کریں اور اس کو صحیح فکروعمل سے آراستہ کریں۔

پیغمبروں کی ضرورت

انسان اس سے خوب واقف ہے کہ وہ فرشتوں کی نقل نہیں اتار سکتا، دونوں کی فطرت الگ ہے، انسان غلطی کرسکتا ہے فرشتے غلطی کرہی نہیں سکتے، اس لیے وہ انسان ہی کی نقل اتارتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کی قدرت میں ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو انسانوں میں سے انتخاب کیا، یہ ممکن تھا کہ کوئی فرشتہ آسمان سے اسی لیے اتار دیا جاتا، لیکن اس میں ایک انسان کے لیے مطاع ومقتدا بننے کی صلاحیت نہیں تھی، انسان یہ عذر پیش کرسکتا تھا کہ یہ مخلوق ہی الگ ہے، اس کی ساخت پرداخت کا انسان سے کوئی جوڑ نہیں، ایک انسان فرشتے کی نقل کیسے اتار سکتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں پیغمبروں کو پیدا کیا لیکن یہ بھی انسانی فطرت کا حصہ ہے کہ وہ اتباع اسی کی کرتا ہے جس کو بلند سمجھتا ہے اور اس کی عظمت اس کے دل کی گہرائیوں میں ہوتی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو اونچا اٹھایا، ان کو معصوم بنایا، اور ان کو ان صفات و اخلاق سے آراستہ کیا جو انسانیت کے لیے معراج کی حیثیت رکھتی ہیں، پھر ان کو معجزات دے کر وہ بلندی عطا فرمادی جو صرف انہیں کا خاصہ ہے۔

آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ان تمام پیغمبروں میں آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین بنایا اور آپ کی رسالت کو مکانی اعتبار سے تمام عالم ہی کے لیے نہیں بلکہ کل عالموں کے لیے اور زمانی اعتبار سے قیامت تک کے لیے وسعت عطا فرمائی، اور سارے انسانوں کے لیے جو قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے آپ صلی اللہ علیہ کی ذات کو نمونہ قرار دیا گیا، اعلان ربانی ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾(۱) ''اور تمہارے لیے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات میں بہترین نمونہ موجود ہے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ سلسلہ نبوت ختم کردیا گیا اور اعلان ہوگیا: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلٰكِن رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ ﴾(۲) ''تمہارے مردوں میں سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ تو اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔''

اسی طرح آپ کی شریعت کو بھی آخری اور مکمل شریعت بتایا گیا، اور صاف صاف کہہ دیا گیا کہ اسلام اپنی مکمل اور دائمی شکل میں آگیا، اب اس میں کمی بیشی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی: ﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الإِسْلَامَ دِيْناً ﴾(۳) ''آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کردیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کردی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین کے پسند کرلیا۔''

چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ عالمی اور دائمی ہے اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کمالات انبیاء کا مجموعہ بنایا گیا اور وہ عظمت بخشی گئی جو کسی کو نہ حاصل ہوسکی ہے اور نہ ہوسکے گی، امامت انبیاء کا شرف آپ کو حاصل ہوا، مقام محمود آپ کا حق ہے اور قیامت میں شفاعت عظمیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ نے آپ کی عظمت کو مخفی نہیں رکھا بلکہ اس کا اعلان فرمادیا ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ (۱) ''ہم

نے آپ کے ذکر کو بلند کیا۔'' آپ کی محبت کو دلوں میں اتار دیا گیا، اس کو ایمان کا حصہ قرار دیا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا:"لا یؤمن أحدكم حتى أكون أحب إليه من والده وولده والناس أجمعين." (۲) ''تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک مومن کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔''

روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: اللہ کے رسول! ہر ایک کی محبت مغلوب ہو چکی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اپنی ذات سے تعلق زیادہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر! ابھی نہیں، حضرت عمرؓ نے قدرے توقف کے بعد فرمایا کہ اب تو اپنی ذات سے زیادہ آپ کی محبت معلوم ہوتی ہے، فرمایا: ہاں اب۔ (ایمان مکمل ہوا)۔ (۳)

حضرت خبیبؓ کو جب پھانسی پر لٹکایا گیا تو کسی مشرک نے کہا کہ ہاں اب تو تم یہ سوچتے ہوگے کہ (معاذ اللہ) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہاری جگہ ہوتے اور تم چھوٹ جاتے؟ حضرت خبیبؓ نے فرمایا کہ ''مجھے تو یہ بھی پسند نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک میں کانٹا بھی چبھے اور میں چھوٹ جاؤں۔'' حضرات صحابہ کی محبت وعقیدت کا حال یہ تھا کہ مشرکین مکہ نے اس کی گواہی دی، صلح حدیبیہ کے موقع پر عروہ بن مسعود ثقفی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کر کے مشرکین مکہ کے پاس گیا تو اس نے کہا کہ ''میں نے عرب وعجم کے بادشاہوں کو دیکھا ہے، ان کے درباروں میں گیا ہوں لیکن بخدا میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھیوں کو جتنا محمد کا فدائی دیکھا اس کی مثال مجھے کہیں نہ ملی، وہ تھوکتے ہیں تو تھوک زمین پر گرنے نہیں پاتا، وضو کرتے ہیں تو وضو کا پانی وہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے منھ پر مل لیتے ہیں۔'' (۱)

محبت واطاعت کی مثالیں

حضرات صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین مخاطب تھے، آپ کے تربیت یافتہ تھے، ان کے واسطے سے سارے عالم میں دین پھیلنا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کو بھی منتخب بنایا تھا، اس جماعت کے دل ودماغ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعظمت کے جو گہرے نقوش ثبت ہوئے تھے اس کی مثال ملنی مشکل ہے، اسی محبت وعظمت کا نتیجہ تھا کہ اطاعت واتباع میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھے، شراب کی حرمت سے پہلے ان میں ایک بڑی تعداد اس کی عادی تھی، لیکن جس لمحہ اس کی حرمت کا اعلان ہوا منھ سے لگے جام انھوں نے الٹ دیئے، مٹکے توڑ دیئے گئے، مدینہ منورہ میں شراب بہہ رہی تھی۔(۲)

ایک صحابی ریشم کا لباس پہن کر حاضر خدمت ہوئے، آپؐ نے ناپسندیدگی ظاہر فرمائی اور اظہار کراہت کے لیے فرمایا کہ اس کو جا کر جلا دو، وہ گھر گئے تنور کی آگ بھڑک رہی تھی، جا کر وہ اس میں ڈال دیا، دوبارہ آپ کی خدمت میں آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ لباس تم نے کیا کیا؟ انھوں نے کہا کہ میں نے آگ میں جلا دیا، آپ نے فرمایا کہ عورتوں کے لیے وہ حلال تھا وہ تم گھر میں دے دیتے، انھوں نے کہا کہ آپ کے فرمان کے بعد اس کی گنجائش ہی کہاں تھی کہ میں اس کو باقی رکھتا۔(۱)

ان کی محبت وعظمت کا حال یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چشم وابرو کے وہ منتظر رہتے، ارشاد ہوتے ہی پہلے مرحلہ میں عمل شروع فرمادیتے، کبھی کبھی اس کی تفصیل ووضاحت بعد میں ہوتی، اس کی مثال اوپر آچکی ہے، کچھ اسی طرح کا واقعہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے ساتھ پیش آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے، وہ مسجد نبوی کے دروازے تک پہونچے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ تمام لوگ بیٹھ

جائیں، وہ وہیں بیٹھ گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اندر آجاؤ انھوں نے فرمایا کہ آپ کے ارشاد کے بعد اس کی گنجائش ہی کہاں تھی کہ ام عبد کا بیٹا کھڑا رہتا۔(۲)

نقل واتباع کے مزاج کی بہترین تصویر صحابہ کی زندگی تھی، انھوں نے پوری طرح سے اپنے رخ کو اس ایک ذات کی طرف کردیا تھا جس سے بہتر کسی کی زندگی لائق اتباع نہیں ہوسکتی تھی، انھوں نے ساری محبت وعظمت کا محور اسی ذات کو قرار دیا تھا جس نے ان کو نئی زندگی بخشی تھی، اس کے آگے اب کسی محبت وعظمت کی کوئی حیثیت نہیں تھی اور تھی تو اسی کے واسطے سے تھی، اس ذات کے اشارہ کے آگے جانیں قربان تھیں۔

عظمت واطاعت کی بنیاد

اس قدسی جماعت کے درمیان ایک تعداد ان بدوؤں کی بھی تھی جو اسلام تو لے آئے تھے لیکن ان میں بعضوں کا حال وہ تھا جو سورۃ الحجرات کے اخیر میں بیان کیا گیا ہے:

﴿قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ.﴾(۱)

”اعراب (بدو) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، آپ فرمادیجئے کہ تم ایمان والے نہیں ہوئے، ہاں تم یہ کہو کہ ہم مسلمان ہوگئے، ابھی ایمان تمہارے دلوں میں (پوری طرح) داخل نہیں ہوا۔“

ان لوگوں کے دلوں میں اول تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اس انداز سے نہ تھی جو ان حضرات صحابہ کے اندر اتر چکی تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ آداب محبت وعظمت سے بھی ناواقف تھے، اپنے کام کاج میں مشغولیت کی بنا پر ان کو آپ کی صحبت وتربیت میں رہنے کے مواقع حاصل نہ ہوسکے تھے، ان کے مزاج میں بھی عام طور پر سختی ہوتی تھی، اس لیے کبھی کبھی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا رویہ نامناسب ہوجاتا تھا اور اس کا احساس بھی ان کو نہیں ہو پاتا تھا، اس کے متعدد واقعات حدیث وسیرت میں موجود ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ عالم انسانیت کا مطاع بنایا گیا تھا اور اطاعت کا صحیح جذبہ اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب عظمت دل میں اتر چکی ہو، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو بطور خاص اس کا مکلّف کیا کہ وہ اپنے کسی قول وفعل سے ایسا مظاہرہ نہ کریں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے خلاف ہو، اور جس طرح اپنی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کو مربوط کیا اور فرمایا: ﴿أَطِيعُوا اللّٰهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ﴾ (۲) "اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔"

اسی طرح اپنی عظمت کے ساتھ رسول کی عظمت کو بھی مربوط فرمایا، سورۃ الحجرات کی ابتدائی آیات کا حاصل یہی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت مطلق دلوں میں ہونی چاہیے کہ وہ خالق کل اور مالک کل ہے، اس کے بعد پھر رسول کی عظمت ضروری ہے کہ وہ بندوں کو خالق سے جوڑنے کا واحد ذریعہ ہے، انسانوں کے اندر اللہ تعالیٰ نے عمومی طور پر نقل واتباع کا مزاج رکھا ہے، اس کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ اس کا رُخ رسول کی طرف ہو، اور پھر رسولوں میں بھی وہ رسول جو امام الرسل ہو، خاتم الانبیاء، رحمۃ للعالمین ہو، دلوں کا رخ اس کی طرف اگر نہ ہوا تو پھر کس کی طرف ہوگا؟ انسانیت کی عظمت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہے اور اس عظمت کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے کہ جو اس پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے قول وفعل سے اس کے خلاف نہ کرے تاکہ اطاعت کا عام مزاج پیدا ہو، سورۃ الحجرات کی پہلی آیت میں یہی حقیقت بیان کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُولِهٖ﴾ (۱)

"اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے آگے مت ہو۔"

آیت شریفہ میں رسول کی عظمت اور اولیت و تقدم کے حق کو ذہن و دماغ میں راسخ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت کے ساتھ عظمت رسول کو جوڑا ہے اور یہ بات صاف کردی ہے کہ اللہ کے ساتھ اس کے رسول کا حق سب سے بڑھ کر ہے، ہر لحاظ سے ایک ایمان والے کو اس کا خیال رہنا چاہیے۔

اگرچہ آیت شریفہ میں خطاب اولین اہل ایمان کو ہے اور اس کے شان نزول میں جو واقعات نقل کیے جاتے ہیں ان سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے لیکن محققین علماء کا یہ اصول ہے کہ "العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب" (اعتبار الفاظ کے عموم ہی کا کیا جائے گا، کسی خاص سبب سے اس حکم کو مربوط نہیں رکھا جائے گا)۔ اس طرح یہ حکم قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے ہے، ہر فیصلہ کے وقت زندگی کے ہر موڑ پر ہر حال میں ہر ایمان والے کو سوچنا ہے پھر آگے بڑھنا ہے، کہیں کسی "غیر" کی عظمت تو جڑ نہیں پکڑ رہی ہے، نفس کے تقاضے کہیں اتنے غالب تو نہیں ہوتے جارہے ہیں کہ ان کو اولیت دی جانے لگی ہو، عرف وعادت اور رسم ورواج کے بندھن کہیں اتنے مضبوط تو نہیں ہو رہے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کی رسی کی گرفت اس کے سامنے ڈھیلی پڑنے لگی ہو، آیت شریفہ میں بڑی عمومیت کے ساتھ یہ حقیقت واضح کردی گئی ہے کہ ایمان والوں کو بہرصورت حق اللہ اور حق الرسول کو مقدم ہی رکھنا ہے، اسی لیے آگے تاکید کے طور پر "وَاتَّقُوا اللّٰہَ" ارشاد فرمایا گیا کہ یہ شان تقویٰ ہے، آگے آیت میں اسی کو تقویٰ کی کسوٹی قرار دیا گیا ہے، عظمت ہوگی تو لحاظ ہوگا، اتباع آسان ہوگا، اور سب کچھ دل کی گہرائیوں کے ساتھ ہوگا، اسی لیے آگے فرمایا: ﴿إِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ "بے شک اللہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔" اس میں یہ وارننگ دے دی گئی کہ یہ عظمت ومحبت اور اطاعت اپنی حقیقت کے ساتھ ضروری ہے، محض صورت کافی نہیں۔

شان نبوت میں بے ادبی کفر کا پیش خیمہ

اسی سورت کی دوسری آیت میں اس کی ایک واضح مثال دی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ.﴾(۱)

''اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی کی آواز پر بلند مت کرو، اور جس طرح تم ایک دوسرے کو زور زور سے پکارتے ہو اس طرح نبی کو زور سے مت پکارو۔''

اس آیت شریفہ میں پہلے تو ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' کو دہرایا گیا ہے، تا کہ اہل ایمان دوبارہ متوجہ ہو جائیں اور یہ بھی واضح ہو جائے کہ آگے جو کچھ کہا جانے والا ہے وہ ایمان ہی کا حصہ ہے، اہل ایمان کو اپنے ایمان کے تحفظ کے لیے اس کا خیال رکھنا ضروری ہے، جس کو نعمت مل چکی ہو اور اس کو نعمت کی قیمت کا کچھ اندازہ بھی ہو وہ اس نعمت کے تحفظ کے لیے کیا کچھ نہیں کر سکتا۔

اس نعمت ایمان کے تحفظ کے لیے عمومیت کے ساتھ پہلی آیت میں جو کچھ کہا گیا تھا اب اس دوسری آیت میں اس کی ایک ایسی مثال دی جا رہی ہے جس سے ہر خاص و عام بات کو سمجھ لے، نبی کے سامنے جب آواز بلند کرنے سے روکا جا رہا ہے، جو عربوں کے اس ماحول میں کوئی بہت زیادہ خلاف ادب بات نہیں تھی، بے تکلفی ان کے مزاج میں داخل تھی لیکن اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان و عظمت کے سامنے اس کو بھی بے ادبی قرار دیا جا رہا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فیصلہ اور حکم کے آگے بڑھ جانا اور اس کی اتباع نہ کرنا، اس کی اہمیت کو دل و جان سے تسلیم نہ کرنا کس درجہ خلاف ادب ہوگا، اسی لیے قرآن مجید کی دوسری آیت میں صراحت کے

ساتھ یہ بات کہہ دی گئی: ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْماً﴾ (۱)
''آپ کے رب کی قسم وہ ہرگز اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتے جب تک وہ اپنے تمام نزاعات میں آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ بنالیں پھر وہ آپ کے فیصلہ پر اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پوری طرح سر تسلیم خم کردیں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوچکی لیکن آپ کی تعلیمات وارشادات موجود ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ شریفہ سامنے ہے، ہر ہر امتی پر فرض ہے کہ اس کے دل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت رکھنے والی ہر ہر چیز کی عظمت ہو، مسجد نبوی کا احترام اور وہاں اپنی آواز کو پست رکھنا ایمان اور تقویٰ کی بات ہے، آپ کی تعلیمات اور طریقہ ہر چیز پر مقدم ہو، بڑی سے بڑی خواہش کی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہ ہو، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سامنے آئے تو ہر چیز ہیچ ہو، یہ عظمت رسالت کی علامت ہے، عظمت سے اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور انسان کے اندر اللہ نے جو اطاعت کا مزاج رکھا ہے اس کا رخ درست ہوجاتا ہے، آگے وارننگ دی گئی ہے:

﴿أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ.﴾ (۱)

''کہیں تمہارے سب کام بیکار چلے جائیں اور تمہیں احساس بھی نہ ہو۔''

آیت کے اس ٹکڑے میں تمام اعمال کے ضائع ہوجانے کا خطرہ ظاہر کیا جارہا ہے اور یہ کفر وشرک کے بعد ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تیز گفتگو کردینا اور بلند آواز سے بولنا اگرچہ سوئے ادب کی اس حد میں نہیں ہے کہ کفر تک بات پہونچ جائے لیکن یہ اس کا پیش خیمہ ضرور ہے، ہلکی سی بھی بے ادبی ہوئی اور طبیعت اس میں رنگ گئی تو آہستہ آہستہ بات اس حد تک پہونچ جاتی ہے جہاں کفر کے حدود شروع ہوجاتے ہیں اور بے ادبی کی وہ شکل سامنے آجاتی ہے کہ پھر ایمان باقی نہیں رہتا، اسی لیے ''وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ'' فرمایا، چونکہ سب کچھ آہستہ آہستہ ہوتا ہے اس لیے آدمی محسوس

بھی نہیں کر پاتا اور وہ کفر کی سرحدوں میں داخل ہو جاتا ہے، یہاں پہنچ کر اس کے تمام اعمال اور ساری نیکیاں بیکار ہو جاتی ہیں۔

دل کو ٹٹولنے کی ضرورت ہے، افکار وخیالات کی نگہداشت ضروری ہے، اعمال کا جائزہ لیتے رہنا لازم ہے، کہیں کوئی ایسی شکل سامنے نہ آنے پائے کہ اللہ اور اس کے رسول پر کسی چیز کو مقدم کیا جانے لگا ہو، اگر ایسا ہے تو یہ خطرہ کی علامت ہے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللّٰهِ أُولٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ☆ إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ☆ وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتّٰى تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ☆﴾

''بلا شبہ جو لوگ اپنی آوازوں کو نبی کے سامنے پست رکھتے ہیں، ایسوں ہی کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے پرکھ لیا ہے، ان کے لیے مغفرت ہے اور بڑا اجر ہے، یقیناً جو لوگ آپ کو حجروں کے باہر سے آواز دیتے ہیں ان میں اکثر سمجھتے نہیں، اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک آپ (خود ہی) ان کے پاس نکل کر آجاتے تو یہ ان کے لیے بہتر تھا، اور اللہ بہت مغفرت کرنے والا، نہایت رحم فرمانے والا ہے۔''

تقویٰ کی کسوٹی

تقویٰ کیا ہے؟

ایمان کے ساتھ قرآن مجید میں تقویٰ کا ذکر بار بار ملتا ہے، تقویٰ احتیاط کا نام ہے، زندگی اسی دھیان کے ساتھ گزرے کہ دامن آلودہ نہ ہو، مزاج میں احتیاط داخل ہوجائے، قدم بڑھے تو اس خیال کے ساتھ کہ یہ اقدام شریعت کے خلاف تو نہیں ہے۔

تقویٰ درحقیقت دل کا فعل ہے جس کا اظہار انسان کی عملی زندگی میں ہوتا ہے، زندگی کے مختلف مراحل میں اس کا عکس جمیل نظر آتا ہے، دل اگر تقویٰ کے رنگ میں رنگ چکا ہے تو زندگی کے ہر موڑ پر اس کی تصویر سامنے آجاتی ہے، قرآن مجید میں مختلف مواقع پر تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے، ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ﴾ (۱) ''اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اس طرح اختیار کرو جیسا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے۔''

پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَاتَّقُوْا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (۲) ''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا تم استطاعت رکھتے ہو۔''

دنیا و آخرت میں اس کے بہترین نتائج کا ذکر بھی قرآن مجید میں جابجا ملتا ہے، دو تین جگہ یہاں تک فرما دیا گیا کہ: ''اللہ تعالیٰ تقویٰ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہے، اس کی نصرت، عنایت، محبت، عطا و کرم سب اس کے لیے ہے۔'' ارشاد ہوتا ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا﴾ (۳) ''بیشک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا۔'' ﴿وَاعْلَمُوْآ أَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (۱) ''جان لو کہ اللہ تعالیٰ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے۔''

تقویٰ کا راستہ

قرآن مجید میں تقویٰ اختیار کرنے کا نسخہ بھی بتایا گیا ہے: ﴿یٰاۤ أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰہَ وَ کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ﴾ (۲) ''اے ایمان والو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اور سچے لوگوں کی صحبت میں رہو۔''

صحبت صادقین تقویٰ اختیار کرنے اور دل کو اس کے رنگ میں رنگنے کا سب سے آسان اور زود اثر نسخہ ہے، اس کے بغیر تقویٰ کا رنگ پختگی کے ساتھ نہیں چڑھ سکتا، صادقین اللہ کے وہ خاص بندے ہیں جن کے قول و عمل اور ظاہر و باطن میں کوئی تضاد نہیں ہے، ان کے اعمال کی شفافیت ان کے دل کی صفائی کا مظہر ہے، ان کا عمل ان کے قول کی تفسیر ہے، اور قول دل کی ترجمانی کرتا ہے، ایمان ان کے دلوں میں اس طرح اتر چکا ہوتا ہے کہ ان کے روئیں روئیں سے ایمان کا نور جھلکتا ہے، صادقین کا یہ تسلسل قرن اول سے قائم ہے اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

عبادت بھی حصول تقویٰ کا راستہ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿یٰاۤ أَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ.﴾ (۳) ''اے لوگو! اپنے رب کی بندگی کرو جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو پیدا کیا جو تم سے پہلے ہوئے ہیں تاکہ تم متقی بن جاؤ۔''

ان عبادتوں میں بھی تقویٰ کا مزاج بنانے میں روزہ کو خاص اہمیت حاصل ہے، ارشاد ہوتا ہے: ﴿یٰاۤ أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ.﴾ (۴) ''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جیسا کہ ان لوگوں پر فرض کیے گئے جو تم سے پہلے گزرے ہیں، تاکہ تم متقی بن جاؤ۔''

تقویٰ کی علامت

حصول تقویٰ کی علامت کیا ہے؟ آدمی متقی کب ہوتا ہے؟ قرآن مجید ہی

میں اس کی بھی وضاحت موجود ہے:﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾(۱) ''جو شعائر اللہ کی عظمت کرے تو یہ دل کے تقویٰ کی بات ہے۔''

شعائر اللہ میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کی نسبت اللہ کی طرف ہو، احکام الٰہی بھی اس میں داخل ہیں، جب کسی حکم کی نسبت اللہ کی طرف کی جائے تو گردن عظمت سے جھک جائے، ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے احکامات بھی اسی میں شامل ہیں، آپ جو کچھ بھی فرماتے ہیں وہ اللہ ہی کا فرمایا ہوا ہے۔

ع　　گفتۂ او گفتۂ اللہ بود

تقویٰ کا بلند معیار

ان تمام شعائر اللہ میں جن میں بیت اللہ بھی شامل ہے سب سے بلند مقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم محبت رب کا مظہر اتم ہیں، یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو تقویٰ کی کسوٹی قرار دیا گیا ہے، سورۃ الحجرات کی تیسری آیت میں پوری صراحت کے ساتھ ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُوْلٰئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى.﴾(۲)

''بلا شبہ جو لوگ اپنی آوازوں کو نبی کے سامنے پست رکھتے ہیں، ایسوں ہی کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے پرکھ لیا ہے۔''

کل مخلوقات میں عظمت ومحبت کا سب سے بڑا مظہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہو تو یہ تقویٰ کی سب سے بڑی نشانی ہے، لیکن جس طرح تقویٰ دل کا فعل ہے اسی طرح یہ عظمت بھی دل کی گہرائیوں کے ساتھ ہو، اس کا یقینی اور لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ ایمان والا قدم قدم پر چونکے گا، کوئی کام بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عالی کے خلاف نہ ہو، ضمیر کا احساس جاگ جائے، طریقۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

اختیار کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت کا جذبہ پیدا ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ومحبت جتنی بڑھتی جاتی ہے تقویٰ کا معیار اتنا ہی بلند ہوتا جاتا ہے، لیکن یہ دھیان ہٹنے نہ پائے کہ یہ عظمت اسی لیے ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے محبوب ترین بندہ ہیں، عبدیت کاملہ آپ ہی کو حاصل ہے اور یہی مقام معراج ہے: ﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا﴾ (۱) ''وہ ذات پاک ہے جو راتوں رات لے گئی اپنے بندہ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف۔''

عظمت وتقدیس میں اگر حدود سے تجاوز ہو گیا اور عبد کو معبود والہ کا درجہ دے دیا گیا، تو یہ درحقیقت شان رسالت میں توہین کے مرادف ہے، کسی کی تعریف اگر حد سے بڑھا دی جائے تو وہ تعریف نہیں رہ جاتی بلکہ تنقیص بن جاتی ہے۔

سورۃ الحجرات کی اس تیسری آیت میں ادب وتعظیم کی جو مثال پیش کی گئی ہے وہ بہت عام فہم مثال ہے، اس کے پیش کرنے کا اصل مقصد آپ کی عظمت کی طرف امت کو متوجہ کرنا ہے، یہ عظمت اطاعت کا زینہ ہے اور اطاعت تقویٰ کی نشانی ہے۔

جو لوگ بھی اپنے دلوں کو رسالت کی عظمت سے منور کر لیتے ہیں اور تقویٰ ان کا مزاج بن جاتا ہے ان کے لیے ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّاَجۡرٌ عَظِيۡمٌ.﴾ (۱)

''ان کے لیے مغفرت ہے اور بڑا اجر ہے۔''

ادب اور محبت کی اعلیٰ مثال

حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے منقول ہے کہ جب سورہ حجرات کی دوسری آیت نازل ہوئی جس میں نبی کی آواز سے اپنی آواز کو پست رکھنے کا حکم دیا گیا ہے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حال یہ ہو گیا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی

کے انداز میں گفتگو فرماتے تھے کہ کہیں آواز تیز نہ ہوجائے،(۲) اس کے بعد ہی یہ تیسری آیت نازل ہوئی۔

اس میں حضرت ابوبکرؓ کے مقام صدیقیت کی طرف بھی اشارہ ہے جو کمال تقویٰ کا مقام ہے، اور اس میں امت کو اس مقام تک پہونچنے کا راستہ بھی دے دیا گیا ہے، جو صدیقین کا مقام ہے، لیکن ان میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیق اکبر ہیں اور صدیقین میں بھی صدیقیت کے اس بلند ترین مرتبہ کو انہیں کے ساتھ خاص کردیا گیا ہے۔

بے ادبوں کی ناسمجھی

اسی سورۃ کی چوتھی اور پانچویں آیت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کی بنا پر سورۃ حجرات کی یہ ابتدائی آیات نازل ہوئیں اور ایک طرح سے یہ دونوں آیتیں تیسری آیت کا تتمہ بھی ہیں، وہاں پوری وضاحت کے ساتھ یہ بات کہہ دی گئی تھی کہ تقویٰ کی کسوٹی یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے ساتھ ہر طرح کا احترام اور ادب وتعظیم ملحوظ رکھی جائے یہاں تک کہ ان کی آواز پر اپنی آواز کو پست رکھا جائے، آواز بلند کرنے والوں اور شان رسالت کا لحاظ نہ کرنے والوں کی ناسمجھی کا اعلان ہورہا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾ (۱)

’’یقیناً جو لوگ آپ کو حجروں کے باہر سے آواز دیتے ہیں ان میں اکثر سمجھتے نہیں۔‘‘

اس آیت کے شان نزول میں واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ بنوتمیم کے کچھ لوگ ایک ضرورت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ وقت آپ کے قیلولے کا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم حجرہ شریفہ میں آرام فرمارہے تھے، وہ لوگ جاہلی رواج کے

مطابق آتے ہی باہر سے آپ کو پکارنے لگے، زمانہ جاہلیت کا رواج یہ تھا کہ جب شعراء وبلغاء کا کوئی وفد کسی بادشاہ یا امیر کے پاس جاتا تو وہ قریب پہونچ کر باہر ہی سے آواز دیتا کہ ہم اشراف عرب ہیں، اصحاب فصاحت وبلاغت ہیں، ہم تعریف کردیں تو باعث شرف ہے اور اگر مذمت کردیں تو باعث ذلت ہے۔(۲)

بنوتمیم کے اس وفد نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا، ان میں اکثریت تو ان لوگوں کی تھی جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، لیکن ان میں چند مسلمان بھی تھے، چونکہ یہ طریقہ شان رسالت کے منافی تھا، اس لیے اس پر اللہ کی طرف سے سرزنش کی گئی، اور قیامت تک کے لیے یہ پیغام دے دیا گیا کہ شان رسالت میں ادنیٰ بے ادبی بلکہ کوئی بھی ایسا عمل جس میں بے ادبی کا شائبہ بھی ہو رب العالمین کو سخت ناپسند ہے، ادنی بے ادبی بھی گستاخی کا پیش خیمہ ہے اور شان رسالت میں گستاخی کفر صریح ہے جو کہ بڑے سے بڑے اعمال کو بے کار کردینے کے لیے کافی ہے اسی لیے اوپر "أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ" کہا جا چکا ہے، (کہیں تمہارے سب کام بیکار چلے جائیں)۔

"الحجرات" حجرۃ کی جمع ہے اس کے معنی کمرہ کے آتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے حجرے اس انداز کے تھے کہ ستون کھجور کے تنے کے تھے اور چھپر کھجور کی چھال سے تیار کرکے ڈال دیا گیا تھا اور بجائے دروازوں کے کمبل کے پردے پڑے ہوئے تھے، یہ اس دور کی بات ہے جب دنیا کے خزانے حضور کے قدموں میں نچھاور ہو رہے تھے۔

ان آواز دینے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے "لَا يَعْقِلُوْنَ" (وہ سمجھ نہیں رکھتے) فرمایا ہے، اس لیے کہ وہ عام بادشاہوں میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں فرق نہیں کرسکے، اور وہ یہ بھی نہ سمجھ سکے کہ ان کو اس کا کیا نقصان پہنچنے والا ہے، یہ ان کی ناسمجھی کی کھلی دلیل تھی۔

طریقۂ ادب

آگے صحیح طریقہ بتایا جارہا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّىٰ تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْراً لَّهُمْ﴾ (۱)

اوراگر وہ صبر کرتے یہاں تک آپ (خود ہی) ان کے پاس نکل کر آجاتے تو یہ ان کے لیے بہتر تھا۔“

کہ یہ کمال ادب تقویٰ کی علامت ہے اور جب تقویٰ مزاج میں داخل ہوجاتا ہے تو انسان کے اندر وہ احساس پیدا ہوجاتا ہے جس کے ذریعہ وہ اچھے برے میں فرق کرتا ہے، اچھائی کی طرف شدید رغبت پیدا ہوجاتی ہے اور برائی سے شدید نفرت محسوس ہونے لگتی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ.﴾

”اوراللہ بہت مغفرت کرنے والا، نہایت رحم فرمانے والا ہے۔“

پر اختتام آیت کا فرمادیا کہ کوئی بھی غلطی کے بعد ندامت کے ساتھ حاضر ہو تو اللہ تعالیٰ پھر اس کی گرفت نہیں فرماتے بلکہ عفوودرگزر کا معاملہ فرماتے ہیں۔

اس آیت شریفہ میں بنیادی طور پر محاسن اخلاق اختیار کرنے کی بھی دعوت دی گئی ہے، اسلام کی یہ اخلاقی تعلیم ہر ایک کے لیے ہے یہاں تک کہ ہر جان رکھنے والے کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی تلقین کی گئی ہے، لیکن سب سے بڑھ کر جو ذات اقدس عظمت وادب کی مستحق ہے وہ ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے جن کے بارے میں قرآن مجید کی گواہی ہے ”إِنَّكَ لَعَلىٰ خُلُقٍ عَظِيْمٍ“ (۱) (بے شک آپ بلند ترین اخلاق پر قائم ہیں) دوسری طرف آیت شریفہ میں جاہلی رسوم وعادات کو ترک کرنے کی بھی تلقین کی گئی ہے، اسلام اپنے پورے نظام کے ساتھ آچکا، جاہلیت کے کسی نعرہ، کسی طریقہ، کسی رواج کے لیے اب کوئی گنجائش نہیں۔

﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْآ إِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ م بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوْآ أَنْ تُصِيْبُوْا قَوْماً م بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِيْنَ☆﴾

''اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اچھی طرح جانچ لو کہ کہیں تم نادانی میں کسی قوم کو نقصان پہنچا بیٹھو، پھر تمہیں اپنے کیے پر پچھتاوا ہو۔''

فیصلہ میں احتیاط

اسلام کا امتیاز

دوسرے تمام مذاہب وادیان میں یہ اسلام کا نمایاں امتیاز اوراس کی اہم ترین خصوصیت ہے کہ اس میں زندگی کے ہر شعبہ کے لیے رہنمائی موجود ہے، زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو تشنہ رہ گیا ہو اوراس میں تسکین قلب ونظر کا سامان نہ کیا گیا ہو، انفرادی زندگی کے مسائل ہوں یا اجتماعی زندگی کی دشواریاں اور پیچیدگیاں، ہر مشکل کا حل اسلام کی روشن اور پاکیزہ تعلیمات میں موجود ہے، اگر اسلام کے ان معاشرتی مسائل وتعلیمات کو سماج میں برتا جائے تو وہ سماج ظلم اورحق تلفیوں کے عالمی ماحول میں امن وآشتی کا ایسا گہوارہ بن سکتا ہے جو ساری دنیا کے لیے نمونہ ہو، اورشاید دنیا کو آج ایسے ماحول کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

دوسروں کا لحاظ

اجتماعی زندگی ایک دوسرے پر اعتماد کے ساتھ مربوط ہے اور یہ ایک انسانی ضرورت ہے، اس اعتماد کے نتائج اگر صرف اپنی ذات تک محدود ہیں تو فیصلہ کرنے والا آزاد ہے، وہ غور کرکے کچھ بھی فیصلہ کرسکتا ہے، لیکن اگر اس اعتماد کے نتائج متعدی ہیں اوراس کی وجہ سے دوسروں پر بھی اس کا اثر پڑ رہا ہے تو اس صورت میں فیصلہ کرنے والا آزاد نہیں ہے، وہ جب تک پوری تحقیق نہیں کرلیتا اور جس پر اس نے اعتماد کیا ہے اس کی سچائی اورامانت داری جس کو اصطلاح میں ''عدالت'' کہتے ہیں ظاہر نہیں ہوجاتی اس وقت تک وہ فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں، اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ اعتماد کرکے کوئی اقدام کربیٹھے اوراس کا نقصان دوسروں کو بھگتنا پڑے، سورۃ الحجرات کی

چھٹی آیت میں اسلام کے اجتماعی نظام زندگی کے اسی اہم جزء کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْماً بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ.﴾ (۱)

''اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اچھی طرح جانچ لو کہ کہیں تم نادانی میں کسی قوم کو نقصان پہنچا بیٹھو، پھر تمہیں اپنے کیے پر پچھتاوا ہو۔''

تفتیش کی ضرورت

یہ معاشرہ کا ایک فرض ہے کہ عام طور پر لوگ کان کے کچے ہوتے ہیں، فوری طور پر فیصلہ کرنے میں ان کو کوئی باک نہیں ہوتا، اور اس پر ان کو ناز ہوتا ہے، اس کو وہ قوت فیصلہ سے تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ حکم شرعی یہ ہے کہ فیصلہ کرنے سے پہلے خوب جانچ پرکھ لیا جائے کہ کسی پر ناحق اس کی زد تو نہیں پڑ رہی ہے، کوئی مظلوم تو نہیں بن رہا ہے، پوری تحقیق کے بعد جب شرح صدر ہو جائے تو فیصلہ کیا جائے، عزم کے ساتھ کیا جائے اور اللہ پر اعتماد ہو۔

عام طور پر اجتماعی کاموں میں، اداروں میں تحریکات میں یہ ناسور پیدا ہو جاتا ہے، ایک بڑا گناہ بدترین گناہ وہ لوگ کرتے ہیں جن کا کام ہی کان بھرنا ہے، اور دوسری بڑی غلطی وہ لوگ کرتے ہیں جو بغیر تحقیق کے ان کی بات تسلیم کر لیتے ہیں، اس کے نتیجہ میں دلوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں اور بعض مرتبہ بڑے بڑے دینی و دعوتی کام، ادارے اور تحریکات شقاق و نفاق کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اس آیت شریفہ میں سماج کے اس ناسور کو بند کیا گیا ہے، ہر سنی سنائی بات، کسی کے بارے میں کسی کا کوئی تبصرہ بغیر تحقیق کے مان لینا اور اس کا حوالہ دینے لگنا یا

اس کے حوالہ سے اقدام کرنے لگنا بالکل غیر اسلامی عمل ہے، حدیث میں آتا ہے:
"كفى بالمرء كذبا أن يحدث بكل ما سمع" (۱) (آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ جو سنے اس کو بیان کرنے لگے)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ

اس آیت کے شان نزول کے بارے میں متعدد روایات ہیں، یہ واقعہ منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ولید بن عقبہ کو قبیلہ بنو المصطلق زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا، جب ان کو معلوم ہوا کہ ولید بن عقبہ زکوۃ وصول کرنے کے لیے آرہے ہیں تو انہوں نے خود ہی مال زکوۃ جمع کیا اور اس کو لے کر اپنے اپنے علاقہ سے باہر نکل آئے تاکہ وہ خود ہی زکوۃ حضرت ولید کے حوالہ کر دیں اور ان کا استقبال بھی ہو جائے، اسلحہ وغیرہ ان کے ساتھ تھے۔ ادھر کسی نے حضرت ولید کو یہ خبر پہونچائی کہ یہ لوگ زکوۃ دینا نہیں چاہتے اسی لیے تم کو قتل کرنے کے لیے آرہے ہیں، حضرت ولید نے اس کو سچ سمجھا اور واپس آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا قصہ سنایا، بعض حضرات کی رائے ہوئی کہ ان پر فوراً حملہ کرنا چاہیے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو تحقیق حال کے لیے بھیجا تو معلوم ہوا کہ ساری باتیں غلط تھیں، کسی نے حضرت ولید کو بالکل غلط خبر دی تھی، وہ لوگ پوری طرح اسلام پر قائم ہیں اور زکوۃ کی ادائیگی کے لیے وہ خود ہی پہلے سے تیار تھے بلکہ بعض روایات میں تو یہ ہے کہ وہ مال زکوۃ لے کر خود ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے، اسی واقعہ پر یہ آیت شریفہ نازل ہوئی۔(۱)

فاسق نا قابل اعتبار

عربی زبان میں فاسق چھلکے سے نکل جانے والے کو کہتے ہیں، اور اصطلاح

شریعت میں فاسق اس کو کہتے ہیں جو احکامات شریعت سے نکل جائے اور اللہ کی نافرمانی کرے، بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے فاسق کا اطلاق حضرت ولید پر کر دیا لیکن کہیں سے بھی اس کا مصداق حضرت ولید نہیں ہو سکتے اس لیے کہ انہوں نے تو جو کچھ ان کو بتایا گیا اس کی خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کر دی، اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی، ان پر کہیں سے کذب کا اطلاق نہیں ہوسکتا ہے، اور پھر (معاذ اللہ) اگر انہوں نے غلط بیانی کی ہوتی تو "یا أیھاالذین آمنوا" کی تعبیر استعمال نہ ہوتی بلکہ "یا أیھا النبی" کی تعبیر استعمال ہوتی، خطاب صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوتا اس لیے کہ انہوں نے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی تھی جبکہ آیت شریفہ میں تمام اہل ایمان کو خطاب ہے، اس میں حضرت ولید بطور خاص شامل ہیں۔ لفظ فاسق کا اول تو اطلاق اس شخص پر ہو رہا ہے جس نے حضرت ولید کو غلط خبر دی تھی، دوسری بات یہ ہے کہ آیت تو بے شک اس پس منظر میں نازل ہوئی لیکن اب جو حکم دیا جا رہا ہے وہ قیامت تک کے لیے ہے، اس میں کسی فاسق کی تعیین نہیں ہے کہ کوئی بھی فاسق خبر دے تو اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا اور ظاہر ہے کہ جب فاسق پر اس سلسلہ میں اعتماد نہیں کیا جائے گا تو کافر و مشرک بدرجہ اولیٰ اس میں داخل ہیں۔

"نبأ" اہم خبر اور قصہ کے معنی میں ہے اس کا اطلاق عام طور پر کسی بڑی یا اہم خبر پر ہوتا ہے، یہاں فاسق اور نبا دونوں نحو (عربک گرامر) کی اصطلاح کے مطابق نکرہ استعمال ہوئے ہیں، اس میں عموم کا مفہوم ہوتا ہے، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ کیسی ہی خبر ہو اگر اس کے اندر اہمیت ہے اور اس کو بتانے والا فاسق ہے تو اعتبار نہیں، اسی طرح کیسا ہی شخص ہو معاشرہ میں اس کی بڑی عزت ہو، دولت مند ہو، صاحب منصب ہو اگر اس کے اندر فسق ہے تو اس کی بات معتبر نہیں، "تبین" کی ضرورت ہے، یعنی تحقیق و جستجو کے بعد ہی فیصلہ ہوسکتا ہے، اس سے یہ بات بھی واضح

ہوجاتی ہے کہ فیصلہ کرنے کے لیے نہ قیل وقال کا اعتبار کیا جائے گا اور نہ گمان کی بنا پر فیصلہ ہوگا، جب تک یقین یا ظن غالب نہ ہوجائے۔ ہاں اگر کوئی معمولی بات بتائی جارہی ہے یا کوئی ایسی خبر دے رہا ہے جس کا کسی پر کوئی اثر پڑنے والا نہیں تو اس میں تحقیق بھی لازم نہیں ہے۔

سنی سنائی باتوں پر یقین کا نقصان

آگے گمان یا سنی سنائی باتوں کی بنا پر جو فیصلے کردیئے جاتے ہیں اس کے نقصان کا بیان ہے۔

"أَنْ تُصِيبُوا قَوْماً بِجَهَالَةٍ" کوئی قوم تمہاری ناواقفیت یا طیش کا شکار نہ ہوجائے، جہالت کے دونوں مفہوم ہوسکتے ہیں ایک مفہوم اس کا ناواقفیت کا ہے یہ علم کی ضد ہے اور دوسرا مفہوم اس کا طیش میں آجانے کا ہے یہ حلم کی ضد ہے، ظاہر ہے دونوں صورتوں میں جب حقیقت حال سامنے آتی ہے تو سوائے ندامت کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا، اسی لیے فرمایا "فَتُصْبِحُوا عَلىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِيْنَ" اپنے کیے پر پھر تم کو نادم ہونا پڑے۔

اصولی باتیں

اس آیت سے بعض اصولی مسائل سامنے آتے ہیں:

۱- غیر معروف شخص کی نہ شہادت کا اعتبار ہے اور نہ روایت کا، قاضی اس وقت گواہی قبول کرسکتا ہے جب گواہ معروف ومعتبر ہو، عادل وثقہ ہو، اسی طرح روایت حدیث میں بھی اسی راوی کا اعتبار ہے جو معروف ہو، "جہالۃ راوی" اصول حدیث کی مستقل اصطلاح ہے، اس کے معنی راوی کا ناواقف ہونا نہیں ہے بلکہ راوی کے بارے میں ناواقفیت مراد ہے، یہ جہالت راوی ان دس اسباب طعن میں داخل ہے جن کی بنا پر راوی مطعون ہوجاتا ہے اور اس کی روایات قبول نہیں کی جاتیں۔(۱)

۲- کسی بھی ایسے عمل سے احتراز ہونا چاہیے جو باعث ندامت ہو، اس میں سارے گناہ اور بے احتیاطیاں شامل ہیں بطورخاص قاضی جب کسی کے بارے میں حدتعزیر، تاوان یا سزا کا فیصلہ کرے تو اس کو بہت تفتیش وتحقیق کے بعد فیصلہ لینا چاہیے، ورنہ وہ خود قابل مواخذہ ہے۔

﴿وَاعْلَمُوْا أَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ، أُولٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ، فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾

''اور جان رکھو کہ اللہ کے رسول تم میں موجود ہیں، اگر وہ اکثر چیزوں میں تمہاری بات مانیں گے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے، البتہ اللہ ہی نے تمہارے لیے ایمان میں رغبت پیدا فرمادی اور کفر و نافرمانی اور معصیت سے تمہیں بیزار کیا، یہی لوگ راہ ہدایت پر ہیں، (جو ہوا وہ) اللہ کے فضل سے اور اس کے احسان سے، اور اللہ خوب جاننے والا، حکمت والا ہے۔''

رسالت کا حق

تین بنیادی حقوق

امت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار احسانات ہیں، ان احسانات کے نتیجہ میں امت پر جو حقوق عائد کیے گئے ہیں ان میں تین بہت ہی اہم اور بنیادی حقوق ہیں، اور یہ تینوں عقیدۂ رسالت سے متعلق ہیں، امت اس وقت تک اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احسان شناس نہیں ہوسکتی اور نہ ہی اس کا عقیدۂ رسالت درست ہوسکتا ہے جب تک وہ ان تینوں حقوق کو سمجھنے والی اور ان کو ادا کرنے والی نہ ہو، ان میں سب سے پہلا حق ''عظمت'' کا ہے، یہ عقیدۂ رسالت کا جزء ہے کہ نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کل مخلوقات میں سب سے افضل سمجھا جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہ اعلان فرمادیا: "أنا سيد ولد آدم ولا فخر"(۱) (میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں اور میں یہ بطور فخر کے نہیں (بلکہ اظہار حقیقت کے لیے کہہ رہا ہوں)۔ دوسرا حق ''محبت'' کا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی محبوب نہ ہو، نہ ماں باپ، نہ مال وتجارت اور نہ ہی اپنی ذات، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اَلنَّبِیُّ أَوْلیٰ بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ" (۲) (نبی ایمان والوں کے لیے اپنی جانوں سے زیادہ محبوب ہیں)۔

اور خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:"لا يؤمن أحدكم حتى أكون أحب إليه من والده وولده والناس أجمعين" (تم میں کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے والد، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں)۔(۱)

تیسرا اہم ترین حق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ''اطاعت'' کا ہے، یہ حق عقیدۂ رسالت کا اہم ترین جزء ہے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو واجب الطاعۃ نہ سمجھے وہ ایمان سے خارج ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:''أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ'' (اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کو اپنی خواہشوں، رغبتوں کے مطابق کرنا غیر ایمانی فعل ہے، سورۂ حجرات کی اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاعْلَمُوْا أَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ﴾ (۲)

''اور جان رکھو کہ اللہ کے رسول تم میں موجود ہیں، اگر وہ اکثر چیزوں میں تمہاری بات مانیں گے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔''

عظمت واطاعت

عظمت رسالت سے متعلق شروع میں جو بات عرض کی جا چکی ہے، وہ بات ایمان کی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں کون ایمان والا اس سے واقف نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف فرما ہیں لیکن جذبۂ اطاعت کو ابھارنے کے لیے یہ تعبیر اختیار کی جا رہی ہے تا کہ عظمت رسالت دل میں بیٹھ جائے اور اطاعت کا جذبہ پیدا ہو جائے، اللہ کی طرف سے یہ احسان جتلایا جا رہا ہے کہ تمہیں یہ خصوصیت حاصل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم میں موجود ہیں، تم براہ راست مستفید ہو رہے ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو فرماتے ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہے، تمام کے تمام تشریعی احکامات اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہیں، ان میں کسی کی رغبت اور خواہشات کو دخل نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو رائے قائم فرماتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مؤید ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ہر طرح کے مصالح اور ضروریات کے جاننے

والے ہیں، علیم وخبیر ہیں، جو حکم بھی رسول کی جانب سے دیا جائے، اس میں چوں چرا کی گنجائش نہیں، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود رائے طلب فرمائیں یا آپ کو مشورہ دیا جائے اور اس میں کسی قسم کا اصرار نہ ہو تو اس کی اجازت ہے، اس کے متعدد واقعات حدیث وسیرت میں موجود ہیں۔

غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کا مشورہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا(۱)، غزوۂ خندق کے موقع پر خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسیؓ سے مشورہ لیا(۲)، غزوۂ احد کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے مدینہ میں قیام کی تھی لیکن وہ صحابہ جو غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے جذبہ جہاد اور شوق شہادت سے سرشار تھے(۳)، انھوں نے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کی رائے دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طیب خاطر کے لیے ان کی رائے قبول فرمالی، اس کا کچھ نقصان بھی ہوا، غزوۂ احد میں بڑے بڑے صحابہ کرام شہید ہوئے، حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو اگر یہ اندازہ ہو جاتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دے رہے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش اس میں ہے تو فوراً سر تسلیم خم کر دیتے اور اگر کوئی مشورہ کی بات ہوتی تو مشورہ بھی دیتے، حضرت بریرہؓ جو حضرت عائشہ کی خادمہ تھیں، ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خانگی مشورہ دیا، انھوں نے دریافت کیا کہ اللہ کے رسول! یہ آپ کا حکم ہے یا صرف خانگی مشورہ ہے؟ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حکم نہیں صرف مشورہ ہے تو انھوں نے معذرت فرمالی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول فرمالیا، حکم نہیں دیا۔(۱)

اسوۂ کاملہ

یہ ساری تفصیل اس زمانہ تک محدود تھی جب احکامات شریعت نازل ہو رہے تھے، ان میں کبھی ردوبدل بھی ہوتا، احکامات منسوخ بھی ہوتے، لیکن تئیس سال کی

مدت میں جب یہ شریعت مکمل ہوگئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گیے تو یہ پورا نظام متعین ہوگیا، اب کسی حکم میں تبدیلی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی، اور نہ اس کی گنجائش باقی رہی کہ کسی مسئلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ دریافت کیا جاسکتا ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر چیز تفصیلی طور پر بیان فرمادی، اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے نظام شریعت کی پیروی ہر امتی کا فرض ہے، اور جو کچھ منقول ہے وہ حکم شریعت ہے، یہ تقسیم اب کسی طرح ممکن نہیں کہ کسی مسئلہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشری رائے کہہ کر چھوڑ دیا جائے، کوئی اگر ایسا سوچتا یا رائے رکھتا ہے تو یہ اس کے لیے خطرے کی بات ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسوۂ کاملہ ہیں، آیت شریفہ میں خطاب براہ راست حضرات صحابہؓ سے ہے، لیکن بالواسطہ پوری امت کو خطاب کیا جارہا ہے، اور جس طرح قرن اول میں ترتیب بدل جانے کے نتیجہ میں حیرانی و سرگردانی کا خطرہ تھا وہ خطرہ آج بھی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری امت کے لیے مطاع بنایا گیا، ہر امتی کی حیثیت بنیادی طور پر مطیع کی ہے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کی حیثیت بھی مطاع کی ہے، علمائے امت کو نائبین رسول اسی بناء پر کہا گیا ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کے حامل ہیں، ان کے ان فیصلوں میں جو قرآن وسنت سے مأخوذ ہوں ان کی پیروی بھی لازم ہے، درحقیقت یہ ان کی پیروی نہیں بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہے۔

اطاعت مطلقہ

جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم حیات طیبہ میں مطاع تھے، اسی طرح آج بھی مطاع ہیں، اور آپ کی اطاعت کا مظہر آپ کی شریعت کا اتباع ہے اور جس طرح آپ کی حیات طیبہ میں آپ کی رائے کو کسی کی خواہش وضرورت یا مصلحت کی خاطر تبدیل کردینے میں سخت حیرانی کا اندیشہ ہے، قرآن مجید میں صاف کہہ دیا گیا ہے:

﴿لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ﴾ ''اگر وہ (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم) بہت سے امور میں تمہاری بات مانیں تو تم چکر میں پڑ جاؤ۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں چونکہ اس کا احتمال تھا کہ صحابہ کی رائے اختیار کی جاتی اور مشاورت ہوتی، اس لیے ''فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ'' فرمایا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس کا کوئی احتمال باقی نہیں رہا، اس لیے کسی بھی منصوص حکم شرعی میں ایسی گفتگو کی بھی گنجائش نہیں، جس طرح کتاب وسنت میں وہ حکم منقول ہے اسی طرح اس کو باقی رکھنا اور عمل کرنا اور کرانا علمائے امت کی ذمہ داری ہے۔

موجودہ دور کا یہ ایک بڑا فتنہ ہے کہ بہت سے نام نہاد علماء یا وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو کتاب وسنت سے ناواقف ہے، بعض مرتبہ منصوص احکامات شرعیہ کے بارے میں ایسی رائے کا اظہار کرتا ہے جس کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، اور اگر وہ رائے تسلیم کر لی جائے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت مطاع کی نہیں رہ جاتی، بلکہ اس میں اپنی رائے کو ان کی رائے پر غالب کرنا ہے، اور اس کے نتیجہ میں امت کے لیے حیرانی کے سوا کچھ نہیں، آج ایک رائے ہے، کل دوسری رائے سامنے آئے گی، اور شریعت کھلواڑ بن کر رہ جائے گی، اور اس کا مقصد فوت ہو جائے گا، قرآن مجید میں اس کے لیے ''عـنـت'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس میں مشقت شدیدہ کا بھی مفہوم ہے، اور اختلال کا بھی، یعنی سخت دشواری کے نتیجہ میں آدمی چکرا کر رہ جائے گا، اس کو پھر کوئی سرا نہ مل سکے گا، امت کے ہر ہر فرد کی ذمہ داری ہے، خواہ کسی طبقہ سے اس کا تعلق ہو، شریعت مطہرہ سے اس کا تعلق کبھی ٹوٹنے نہ پائے، اس لیے کہ جب ایک مرتبہ آدمی تاریکی میں پڑ جاتا ہے تو پھر اس کو راستہ ملنا سخت دشوار ہو جاتا ہے: ''ومن لم يجعل الله له نورا فما له من نور'' (اللہ جس کو روشنی نہ دے اس کو روشنی کہاں سے ملے گی؟!)

صحابہؓ پر اللہ کا انعام

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ورفاقت کے لیے منتخب فرمایا تھا، پوری جماعت کی تربیت خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی، ان کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے محبت رسولؐ سے معمور کردیا تھا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چشم وابرو کے منتظر رہتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت واطاعت کا جو نمونہ انھوں نے چھوڑا وہ پوری امت کے لیے بڑا سرمایہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ان پر خاص انعام یہ تھا کہ وہ مزاج نبوت میں ڈھل گئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چاہت ان کی چاہت تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے آگے دنیا کی بڑی سے بڑی دولت وعزت قربان کردینا ان کے لیے بڑی بات نہ تھی، اور یہ صرف ان کا حال نہ تھا بلکہ ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، ایمان سے ان کے دل لبریز تھے، خیر ان کے مزاج میں داخل ہوگیا تھا، اللہ تعالیٰ ان پر اپنے اس انعام کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ، أُولٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ.﴾(۱)

''البتہ اللہ ہی نے تمہارے لیے ایمان میں رغبت پیدا فرمادی اور کفر و نافرمانی اور معصیت سے تمہیں بیزار کیا، یہی لوگ راہ ہدایت پر ہیں۔''

آگے ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً﴾

''(جو ہوا وہ) اللہ کے فضل سے اور اس کے احسان سے۔''

وہ صحابہ جن کی بڑی تعداد ایمان لانے سے پہلے دوسرے رنگ میں رنگی

ہوئی تھی، عمومی ماحول کے اثرات اکثر لوگوں پر تھے، لڑائی جھگڑا جن کی گھٹی میں پڑا تھا، اور دسیوں برائیاں ان میں پائی جاتی تھیں، ایمان لاتے ہی ان کی دنیا بدل گئی، ایک صحابیؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ایمان لانے کے بعد کہیں سے گذر رہے تھے وہاں کسی خاتون نے جس سے پہلے ان کے تعلقات رہ چکے تھے دل لگی کی دعوت دی، انھوں نے فرمایا کہ اب یہ نہیں ہوسکتا، میں ایمان لا چکا ہوں، ایمان ایسی باتوں سے روکتا ہے(۲)، ان میں کتنے شراب کے رسیا تھے، لیکن حرمت کا اعلان آتے ہی پھر کبھی خیال بھی نہ لائے، ان کے دلوں کی کیفیت ایسی بدلی کہ ایسی تبدیلی کا نظارہ دنیا نے کبھی نہ کیا ہوگا، یہ ان کے ساتھ اللہ کا خاص فضل تھا، اللہ نے ان کا انتخاب اپنے نبی کی صحبت کے لیے فرمایا تھا، ان میں ایمان لانے سے پہلے بھی نفاق نہیں تھا، دوغلا پن نہیں تھا، وہ صاف گو تھے، حقیقت شناس تھے، جب کسی بات کو صحیح سمجھتے تو اسی کے ہو رہتے، ایمان کے بعد جب حق ان کے سامنے آیا اور ان کے دلوں میں اس کی مٹھاس پیدا ہوئی تو ان کی رت بدل گئی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت وتربیت میں ایسے ڈھل گئے اور حق کے ایسے داعی بن گئے کہ جہاں گئے وہاں کی دنیا بدل ڈالی، اپنے بلند اخلاق وکردار سے زہد وپرہیز گاری سے اور خلوص ومحبت سے انھوں نے دلوں کو فتح کرلیا، چونکہ دین کی حامل وہ ہی جماعت تھی جو دنیائے اسلام کی معلم بنی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص امتیاز بخشا تھا تاکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین سیکھ کر اور آپ کے رنگ میں رنگ کر دنیا کے مختلف علاقوں میں دین کی مکمل ترجمانی کرسکیں، پھر آگے اس کے بارے میں قرآن مجید کی گواہی ہے کہ:

﴿أُولٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ.﴾

''یہی لوگ راہ ہدایت پر ہیں۔''

دوسری جگہ ان کے بارے میں یہ اعلان بھی ہو چکا ہے کہ ''رضی اللہ

عنهم و رضوا عنه" (اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے)۔

بعد میں آنے والوں کے لیے خطرہ

آیت کے آغاز میں ایک بڑے خطرہ سے آگاہ کیا گیا تھا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تم اپنی مرضی پر چلانا چاہو گے تو پورا نظام بگڑ کر رہ جائے گا، مگر اس کے آگے ہی یہ وضاحت کی جا رہی ہے کہ تم پر اللہ کا بڑا فضل یہ ہے کہ تم اس سے دور رہے، اللہ نے خیر کو تمہارے دلوں میں پیدا فرما دیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت تمہارے مزاج میں داخل کر دی ہے، اس سے ایک اشارہ یہ ملتا ہے کہ حضرات صحابہ کے دور میں تو وہ خطرہ بہت کم تھا، اس لیے کہ وہ اطاعت میں ڈھلے ہوئے تھے، لیکن یہ خطرہ زمانۂ نبوت سے دوری کے ساتھ ساتھ بڑھتا جائے گا، گرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہ رہیں گے لیکن لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو اپنے مفاد کے مطابق کرنے کی کوشش کریں گے، گویا کہ حدیث کو اپنی مرضی کے مطابق بنائیں گے، اور اس کی بیجا تاویلیں کریں گے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں آپ کو اپنی رائے پر آمادہ کرنا، جیسے وہاں کہا گیا کہ اگر رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری ہر بات ماننے لگیں گے تو تم سخت دشواری میں پڑ جاؤ گے، اسی طرح اگر ارشادات رسول کو بھی اپنی مرضی اور اپنی خواہش کے مطابق کیا جائے گا تو اس کے نتیجہ میں بھی حیرانی و سرگردانی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

﴿وَإِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَإِنْ م بَغَتْ إِحْدٰهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوْا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ إِلٰى أَمْرِ اللّٰهِ فَإِنْ فَآءَتْ فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوْآ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ☆﴾

”اور اگر اہل ایمان میں دو فریق لڑ پڑیں تو ان دونوں میں میل ملاپ کرادو، پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کے لیے جھک جائے، پس اگر وہ جھک جاتا ہے تو پھر دونوں میں برابری سے صلح کرادو اور انصاف سے کام لو، بلا شبہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔“

صلاح واصلاح کا اسلامی نظام

عالمگیر فساد

صلاح واصلاح کا جو عالمی نظام اسلام نے پیش کیا ہے، اگر اس کو دنیا اختیار کرلے تو فساد وافساد کے عالمگیر ماحول میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے، سیلاب جتنا تیز ہو باندھ اس کی شدت کو دیکھ کر باندھا جاتا ہے، آج پوری دنیا جس طرح کرپشن کا شکار ہے، اتنے وسیع پیمانہ پر شاید ہی کبھی بگاڑ پھیلا ہو، قرآن مجید نے اس کی وجہ بھی بیان کردی ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ﴾ (۱) (خشکی اور تری میں بگاڑ پھیل گیا ہے، لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے۔)

اعمال کی خاصیتیں

اللہ تعالیٰ نے جس طرح اشیاء میں خواص رکھے ہیں، اسی طرح اعمال میں بھی خواص رکھے ہیں، حدیثوں میں اس کی تفصیلات موجود ہیں، گانے بجانے اور فحاشی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے بعد زلزلوں اور طوفانوں کی کثرت ہوتی ہے، زمانہ اس کا گواہ ہے، دنیا میں آج فحاشی اور گانے بجانے کو جس طرح ایک فن کی شکل دے دی گئی ہے اور اس کو تعلیم کا اہم جزء بنادیا گیا ہے، شاید پہلے اس کا تصور بھی نہ کیا گیا ہوگا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف ملکوں میں زلزلوں اور طوفانوں کا ایک تسلسل سا معلوم ہوتا ہے۔

دنیا میں قیامت سے پہلے قیامت کا منظر نگاہوں کے سامنے ہے، ہر شخص کو صرف اپنی فکر لگی ہے، اپنے تھوڑے سے فائدہ کے لیے وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہے، اس خودغرضی کی خاصیت بے برکتی ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ افراد افراد کے ساتھ، جماعتیں جماعتوں کے ساتھ اور ملک ملکوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہیں، عدل

وانصاف کے پیمانے بدل گئے ہیں، اصول واخلاق کا توازن بگڑ گیا ہے۔

اصلاح کی دعوت

اسلام نے صرف صلاح ہی نہیں بلکہ اصلاح کی بھی دعوت دی ہے، سیلاب آتا ہے تو کوئی اپنے گھر کے دروازے بند کرکے محفوظ نہیں رہ سکتا، تیز موجیں اس کا خاتمہ کرکے دم لیں گی، اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ سیلاب کو روکنے کی کوشش کی جائے اور اس کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی جائے۔

موجودہ عالمی نظام کا سب سے بڑا نعرہ آزادی کا ہے، کوئی کچھ بھی کرے کسی کو اس وقت تک روکنے کا حق نہیں جب تک وہ دوسرے سے تعرض نہیں کرتا اور اس قانون میں بھی ایسا کھوکھلا پن ہے کہ ملک ملک کو ہڑپ کر جاتے ہیں، کسی کے منھ میں زبان نہیں جو بولے "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا اندھا نظام اپنی ترقی یافتہ شکل میں پوری طرح موجود ہے۔

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو اس کا مکلّف کیا ہے کہ وہ صلاح کے ساتھ اصلاح کے عمل کو جاری رکھیں، آپس کے جھگڑوں کو دور کریں، نزاعات کا تصفیہ کریں، تاکہ اللہ کی بخشی ہوئی صلاحیتیں صحیح مثبت اور تعمیری کاموں میں صرف ہوں، خاص طور پر اگر ایمان والوں میں نزاعی شکلیں پیدا ہو جائیں تو اصلاح کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

آپس کے جھگڑوں کا وبال

آپس کے جھگڑے خواہ کتنے ہی معمولی کیوں نہ نظر آتے ہوں، اسلام میں ان کو بدترین گناہوں میں شمار کیا گیا ہے، ایک حدیث میں ان کو "حالقہ"(۱) سے تعبیر کیا گیا ہے، حالقہ استرے کو کہتے ہیں، جس طرح استرے سے سر کے بال صاف

ہوجاتے ہیں، اسی طرح آپس کے جھگڑوں سے دین آہستہ آہستہ نکل جاتا ہے، جو اعمال کیے گئے ہیں اس کا خطرہ پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ اعمال رائیگاں نہ چلے جائیں، اس لیے کہ نزاع میں عام طور پر آدمی اپنی زیادتی محسوس نہیں کرپایا، وہ فریق ثانی پر ظلم کرتا ہے، لیکن اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا ہے، دوسرے کا حق مارتا ہے، اس کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے، لیکن خود انصاف کی دہائی دیتا ہے، اس کے اس ظلم وزیادتی کے نتیجہ میں حرماں نصیبی اس کا مقدر بنتی ہے، دنیا میں وہ اس کو اپنی عزت کا سوال سمجھتا ہے، لیکن آخرت میں اس سے بڑھ کر مفلس کون ہوگا کہ نیکیوں کے باوجود اس کے بارے میں جہنم کا فیصلہ کردیا جائے۔

جھگڑوں کی خاصیت اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کمزوری پیدا ہوجاتی ہے، دشمن کو غالب آنے کے مواقع حاصل ہوجاتے ہیں، قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا﴾ (۲) (اور آپس میں جھگڑا مت کرو (ورنہ) تو تم ناکام ہوجاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور ثابت قدم رہو۔)

صلح صفائی کا حکم

جس طرح خود جھگڑوں میں پڑنا باعث خفت وذلت ہوتا ہے اور اس سے دور رہنے کی تلقین کی گئی ہے، اسی طرح اہل ایمان کو یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ جھگڑے کے ماحول کو بھی بدلنے کی کوشش کریں اور اگر اہل ایمان آپس میں الجھ رہے ہوں تو ان میں صلح کرادی جائے، دو ٹوٹے دلوں کو جوڑنا اور آپس میں صلح کرادینا اتنا اہم اور فضیلت والا کام ہے کہ اس کے لیے اگر کچھ بات بھی بنانی پڑے تو اس کی اجازت دی گئی ہے۔

سورۃ الحجرات کی چھٹی آیت میں یہ حکم تھا کہ ہر سنی سنائی بات پر کان نہ دھرا جائے، اگر ایسا شخص کوئی خبر لے کر آیا ہے جس کا اعتبار نہیں تو بغیر تحقیق کوئی اقدام نہ کیا جائے، اگر غلطی ہوگئی تو اس کا نتیجہ جھگڑے کی شکل میں ظاہر ہوگا، اور یہ بات بڑھتے بڑھتے

قتل وغارت گری تک پہنچ سکتی ہے،اسی لیے اسی سورہ کی نویں آیت میں یہ تلقین کی جارہی ہے کہ اگر اہل ایمان میں جھگڑے کی یہ شکل پیدا ہوتو ان میں صلح کی کوشش کی جائے اور اگر کوئی فریق صلح پر رضا مند نہ ہوتو حتی المقدور اس کو اس پر آمادہ کیا جائے،ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَإِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا﴾ (۱)

''اور اگر اہل ایمان میں دو فریق لڑ پڑیں تو ان دونوں میں میل ملاپ کرادو۔''

عربک گرامر کا یہ قاعدہ ہے کہ اگر اسم (Noun) پر ''اِن'' کا لفظ آجائے تو اس کے بعد فعل ماضی،مضارع کے معنیٰ دیتا ہے، یہاں پر بھی بظاہر یہی مفہوم ہے کہ اگر دو گروہوں میں جھگڑا بڑھ جائے اور اس کا خطرہ پیدا ہو جائے کہ وہ قتل وغارت گری شروع کر دیں گے تو دونوں میں صلح کرادو، صلح کا یہ کام جتنی جلدی کرادیا جائے،اور بات آگے نہ بڑھنے دی جائے،اتنا ہی یہ آسان ہے، جتنی اس میں تاخیر ہوتی جاتی ہے،دشواریاں بڑھتی جاتی ہیں۔

خود صلح کرانے میں دشواری ہو اور اس کا غالب امکان ہو کہ دونوں فریق یا دونوں میں سے کوئی ایک فریق اس کی بات ماننے پر رضا مند نہ ہوگا تو بہتر ہے کہ درمیان میں ایسے لوگوں سے ثالثی کرائی جائے جن کا دونوں فریقوں پر اثر ہو اور دونوں فریق اس کی بات میں وزن محسوس کرتے ہوں۔

آیت کے شان نزول میں بعض واقعات بھی نقل کیے جاتے ہیں،لیکن اس میں خطاب جس طرح قرنِ اول کے مسلمانوں کو کیا گیا ہے،اسی طرح قیامت تک کے مسلمان اس کے مخاطب ہیں،ان کی ذمہ داری ہے کہ اصلاح کے عمل کو جاری رکھیں،اگر صورت حال یہ پیدا ہو کہ ایک گروہ ظلم وزیادتی پر آمادہ ہو جائے اور وہ کسی کی بات سننے کو تیار نہ ہو تو ہر ممکن طاقت سے اس فریق کو ظلم وزیادتی سے روکا جائے،ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَإِنۢ بَغَتْ إِحْدٰهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتّٰى تَفِيئَ إِلٰى أَمْرِ اللّٰهِ﴾(۱)

''پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کے لیے جھک جائے۔''

''بغی'' بغاوت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن اس کے اصل معنی حد سے تجاوز کرنے اور زیادتی کرنے کے ہیں، جو فریق بھی زیادتی کررہا ہو اور بات سننے کا روادار نہ ہو تو مسلمانوں کے نمائندہ اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر طرح سے روکنے کی کوشش کریں، جہاں مسلمانوں کے پاس قوتِ نافذہ ہو، وہ اس قوت کا استعمال کریں تاکہ فساد کا وہ دروازہ بند ہو جائے، اور جہاں قوتِ نافذہ نہ ہو وہاں سماج کے دباؤ سے اجتماعی اور قانونی طاقت سے زیادتی کرنے والے فریق کو روکنے کی کوشش کی جائے۔

صلح کرانے کے آداب

آگے جو بات کہی جارہی ہے وہ صرف اسلام ہی کے متوازن عادلانہ نظام کا ایک حصہ ہے، دوسری جگہ اس کا تصور بھی مشکل ہے، طاقت سے ایک فریق کو روکنے کے باوجود اصلاح کی دوسری کوشش کا حکم دیا جارہا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب قوت کے استعمال میں بھی اعتدال وتوازن قائم رہے، سب سے مشکل ترین کام ہے، آدمی خلاف ہوتا ہے تو دشمنی کے سارے حدود پار کرنے لگتا ہے، چاہتا ہے تو محبوب کی خامیاں خوبیوں کی شکل میں اس کو نظر آتی ہیں، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ:

''أحبب حبيبك هونا ما عسى أن يكون بغيضك يوما ما، وابغض بغيضك هونا ما عسى أن يكون حبيبك يوما ما'' (۱)

(محبوب سے محبت کرو تو بھی اعتدال کے ساتھ، ممکن ہے کہ کسی دن وہ

تمہارا مبغوض بن جائے ،نفرت کرو تو بھی توازن کے ساتھ ، ہوسکتا ہے کہ وہ کسی دن تمہارا محبوب بن جائے۔)

دوفریقوں میں ثالثی کرنے والوں کو یہ بنیادی حکم ہے کہ اگر ایک فریق بات نہیں مانتا اور وہ ظلم پر کمر بستہ ہے، اس کو بہ زورِ طاقت ظلم سے روک دو، لیکن طاقت کے استعمال میں توازن قائم رہے، اصلاح کی کوشش ابھی ختم نہیں ہوئی، طاقت کے زور پر سہی، جب ایک فریق جھک گیا اور زیادتی سے باز آ گیا تو اب دوبارہ دونوں فریقوں کو جوڑنے کی کوشش کرو اور دلوں کو ملانے کا کام کرو، ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَإِنْ فَآءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا﴾ (۲)

''پس اگر وہ جھک جاتا ہے تو پھر دونوں میں برابری سے صلح کرادو اور انصاف سے کام لو۔''

صلح کی دوسری کوشش کے موقع پر بار بار انصاف کا حکم اسی لیے دیا جا رہا ہے کہ جب صلح کرانے والے، زیادتی کرنے والے فریق کے خلاف طاقت کا استعمال کر چکیں اور اس کی ضرورت اسی لیے پڑی کہ انھوں نے بات نہیں مانی تو طبعی طور پر میلان دوسرے فریق کی طرف ہونے کا غالب امکان ہے، اس اندیشہ کے پیش نظر اس کی تاکید کی جا رہی ہے کہ کسی کی طرف فیصلہ کرنے میں جھکاؤ نہ ہو، اور صلح ممکن بھی اسی وقت ہے کہ جب دونوں فریق صلح کرانے والوں کو ہمدرد سمجھیں اور کسی ایک فریق کی طرف جھکاؤ محسوس نہ کیا جائے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ.﴾ (۱)

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔''

پر پوری آیت کا اختتام کیا جا رہا ہے، جو مسک الختام ہے، صلح و اصلاح کی ساری کوششیں جو بڑی مبارک ہیں، اور ان پر اجر کے بڑے وعدے ہیں، اسی وقت

کامیاب ہوسکتی ہیں جب انصاف اور عدل کے ساتھ یہ کوششیں کی جائیں، اور پھر یہ علیٰ العموم انعام ربانی ہے، ان لوگوں کے لیے جو ہر موقع پر انصاف سے کام لیتے ہیں۔

یہیں سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ جب اصلاح ذات البین میں، ٹوٹے اور روٹھے دلوں کو جوڑنے میں اس قدر اجر وثواب ہے کہ جھوٹ جیسی برائی کو بھی اس کے لیے ایک حد تک روا رکھا گیا، تو اگر کوئی دلوں کو توڑنے کا کام کرے، لوگوں کو آپس میں لڑائے اور نمک مرچ لگا کر بات کو بگاڑے تو وہ کس قدر غضب الٰہی کا مستحق ہے!!

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾

’’تمام اہل ایمان بھائی بھائی ہیں، تو اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرادیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحمت ہو۔‘‘

اخوت اسلامی

ایمانی اخوت کی طاقت

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو محبت کی ایک لڑی میں پرو دیا، اپنے بیگانے ہوگئے اور بیگانے سگے بھائیوں سے بڑھ کر قرار پائے، خونی رشتہ کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن اسلامی رشتہ خونی رشتہ سے بڑھ کر ہے، خونی رشتہ طبعی اور فطری ہے، اس میں شعور و تعقل کو دخل نہیں ہوتا لیکن ایمانی رشتہ عقل و آگہی کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے، عقل کے راستہ سے یہ محبت دل میں داخل ہوتی ہے پھر کوئی بڑی سے بڑی طاقت اس کو جدا نہیں کرسکتی، خونی رشتے ٹوٹتے ہوئے دیکھے گئے ہیں لیکن ایمان کا رشتہ جب استوار ہوجاتا ہے تو شاید ہی اس کو کسی نے ٹوٹتے ہوئے دیکھا ہو، اس ایمانی رشتہ کی بنیاد ایمان ہے، ایمان کی پختگی کے ساتھ اس کی پختگی قائم ہے، ایمان کی کمزوری سے یہ رشتہ بھی کمزور پڑجاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض تربیت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے لوگ اس رشتہ سے واقف نہ تھے، ان کے تعلقات قبائل کی بنیادوں پر قائم تھے، ان کے یہ تعلقات اور آپس کے رشتے اندھے اصولوں کے ساتھ وابستہ تھے، ان کا نعرہ تھا "أنصر أخاك ظالماً أو مظلوماً" (ہر صورت میں بھائی کی مدد کرنی ہے وہ ظالم ہو یا مظلوم)، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد اسلامی اخوت کا جو رشتہ عطا فرمایا اس کو پاکیزہ اصولوں کے ساتھ جوڑا اور اس کی روشنی میں ان اولین مسلمانوں کی ایسی تربیت فرمائی کہ وہ ان تعلیمات میں ڈھل گئے، اسلامی اخلاق و تعلیمات اور اجتماعی زندگی کے اصول ان

کے مزاج میں داخل ہوگئے، اسی لیے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا "أنصر أخاك ظالماً أو مظلوما" (اپنے بھائی کی مدد کرو ظالم ہو یا مظلوم)، تو انہوں نے فوراً کہا "هذا ننصره مظلوما" (ہم مظلوم کی مدد کرتے ہیں)، "فكيف ننصره ظالما" (ظالم کی مدد کیسے کریں؟)، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمنعه من الظلم" (اس کو ظلم نہ کرنے دو، یہی اس کی مدد ہے)(۱)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے ان کے مزاج بدل گئے، کل تک جن کی زبانیں اسی نعرہ کو دہراتے دہراتے نہ تھکتیں تھیں، آج جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے یہ جملہ دہرایا تو وہ چونک گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا رخ پھیر دیا اور اس کی حقیقت بیان فرمادی کہ تم جس کو مدد سمجھتے ہو وہ دشمنی ہے، مدد تو یہ ہے کہ ظالم کو ظلم سے روک دیا جائے تاکہ وہ اس کے اخروی اور حقیقی نقصانات سے محفوظ رہے۔

صحابہ کی زندگی

اسی پاکیزہ اسلامی بھائی چارہ کا اثر تھا کہ اسلام پھیلتا جاتا تھا اور اسلامی برادری بڑھتی جاتی تھی، اس میں رنگ ونسل کی کوئی تمیز نہ تھی، کوئی حبش کا ہے تو کوئی فارس کا، کوئی خالص عربی النسل ہے تو کوئی عجم کے خاندان کا فرد ہے، سب ایک دسترخوان کے شریک ہیں، سب اپنے اپنے ظرف کے اعتبار سے لے رہے ہیں، کسی کو کسی سے کوئی عار ہے نہ بیر، یہ اسی اسلامی اخوت کا نمونہ تھا کہ عرب کے سردار فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایک حبشی نژاد سیاہ فام کے بارے میں "سیدنا" (ا) ہمارے آقا کے الفاظ استعمال کررہے ہیں، حضرت بلال مؤذن رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ رتبہ کہاں سے ملا؟ یہ اسی اسلامی اخوت کا نتیجہ تھا۔

حضرات صحابہ کا مزاج بن چکا تھا، وہ اس اسلامی اخوت کے حامل وترجمان تھے، پھر ہجرت مدینہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مواخات کی جو فضا

قائم فرمائی، مہاجرین وانصار کے درمیان اس کے نتیجہ میں جو محبت قائم ہوئی تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کرسکتی، ایک ایک مہاجر کو انصاری کا بھائی قرار دیا گیا، حضرات انصار نے اس کا حق ادا کردیا، اپنا کل مال دو حصوں میں تقسیم کردیا اور مہاجرین کو اس میں پوری طرح شریک کرنا چاہا، اس کی انتہائی مثال یہ ہے کہ ایک انصاری نے کہا کہ میری دو بیویاں ہیں آپ جس کو پسند کرنا چاہیں قبول کرلیں میں طلاق دے دیتا ہوں، آپ اس سے نکاح کرلیں۔ حضرات مہاجرین کہاں اس پر راضی ہوتے، انہوں نے کہا کہ بازار کا پتہ بتادیجیے، یہ مال آپ کو مبارک ہو۔ (۲)

اسی اسلامی اخوت کا نتیجہ تھا کہ اوس وخزرج کے قبائل جن کی دشمنی سالہا سال سے چلی آرہی تھی، جنگ بعاث جن میں چالیس سال تک جاری رہ چکی تھی اسلام نے اس طرح ان کو جوڑ دیا کہ آج دونوں کی الگ الگ پہچان مشکل ہے، دنیا دونوں قبیلوں کو انصار کے نام سے جانتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس احسان کا ذکر قرآن مجید میں فرمایا ہے: ﴿وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَآءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا﴾ (۳) (اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ تم (آپس میں ایک دوسرے کے) دشمن تھے تو اس (اللہ) نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا، سو تم اس کی نعمت سے (آپس میں) بھائی بھائی ہوگئے۔)

سورہ الحجرات کی دسویں آیت میں اسی بات کو تازہ کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ (۱)

''تمام اہل ایمان بھائی بھائی ہیں۔''

رشتہ محبت

آیت کے اس حصہ میں کئی باتیں قابل غور ہیں، بھائی کا بھائی سے کیا رشتہ

ہوتا ہے، کیسی محبت ہوتی ہے، آج خالص مادی دور میں شاید اس کو سمجھنا مشکل ہو، یورپ کے خالص مادی اور میکانکی نظام زندگی نے ساری انسانی قدریں خاک میں ملادیں، اخبار میں اکثر یہ خبریں بھی آنے لگی ہیں کہ ماں نے بیٹے کو قتل کیا، نوزائیدہ بچہ کو اس کی ماں کوڑے دان میں ڈال گئی، بعثت نبوی سے پہلے عربوں میں ہزار جاہلیت کے باجود یہ درندگی نہ تھی، وہ بھائی کے رشتۂ محبت سے آشنا تھے، اسی رشتہ کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے، ایک بھائی کا بھائی سے جو تعلق ہوتا ہے وہی تعلق ایک ایمان والے کا دوسرے ایمان والے سے ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تشبیہ میں کوئی واسطہ اختیار نہیں کیا گیا، یہ نہیں کہا گیا کہ ایمان والے بھائیوں کی طرح ہیں، براہ راست کہا جارہا ہے کہ وہ تو بھائی بھائی ہیں۔ تیسری ایک بات اور قابل توجہ ہے، وہ یہ ہے کہ بات کہنے سے پہلے "إنما" کا لفظ استعمال ہوا ہے، عربی گرامر کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر لفظ "إنما" کے ساتھ کسی چیز کی خبر دی جارہی ہو تو وہ خبر بالکل نئی نہیں ہوتی، لوگ اس کے بارے میں پہلے سے واقف ہوتے ہیں گویا اس میں یہ اشارہ ہے کہ تم اخوت ایمانی سے واقف ہو تو تمہیں اس کا خیال رکھنا چاہیے۔

زندگی کا مزہ

آگے بطور خاص اس چیز کا ذکر کیا جارہا ہے جس کی تمہید کے طور پر ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ﴾ کہا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَأَصْلِحُوْا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ﴾

"تو اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرادیا کرو۔"

یہ پوری آیت درحقیقت گذشتہ آیت کا تتمہ ہے جس میں یہ حکم تھا کہ اگر دو مسلمان گروہوں میں تصادم ہوجائے تو تمہیں صلح صفائی کرادینی چاہیے، یہاں اس کی تحریض کی جارہی ہے، اور اس کی وجہ بھی بیان ہورہی ہے کہ اگر دو بھائیوں میں جھگڑا

ہو جائے تو بقیہ بھائیوں کو رشتۂ محبت کی بنا پر اس کی فکر ہوتی ہے کہ دونوں کو ملا دیا جائے تاکہ سب کو اس مصیبت سے نجات ملے اور زندگی کا مزہ آئے، اسی طرح ایمانی رشتۂ اخوت میں بھی جو کسی طرح بھی خونی رشتہ سے کم نہیں بلکہ بعض وجوہات کی بنا پر اس سے بڑھ کر ہے، یہی فکر ہونی چاہیے، اگر دو ایمان والوں میں یا دو مسلمان گروہوں میں نزاع ہو تو بقیہ ایمان والے بھائیوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ صلح صفائی کی فکر کریں تاکہ بہتر ماحول پیدا ہو، آپس کے تعلقات استوار رہیں اور جینے کا مزہ آئے، آیت کے اخیر میں فرمایا:

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ.﴾(۱)

"اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحمت ہو۔"

اس میں خطاب صرف صلح کرانے والوں کو ہی نہیں ہے بلکہ دونوں جھگڑنے والے فریق بھی اس میں شامل ہیں، اور تمام مسلمانوں کے لیے ایک عمومی حکم بھی ہے، تقوی کی زندگی اختیار کرنے سے مومن اللہ کی رحمت خاص کا مستحق بنتا ہے، عام طور پر جھگڑے دل کے میل سے پیدا ہوتے ہیں، کینہ کپٹ، حسد، غیبت، چغلی، حق تلفیاں جھگڑوں کی بنیاد بنتی ہیں، اگر تقوی مزاج میں داخل ہوگا تو دلوں میں صفائی پیدا ہوگی، قلبی امراض سے شفا ملے گی، دل آئینہ کی طرح شفاف ہو جائے گا، اپنی برائیاں نظر آنے لگیں گی، اب دوسروں کی آنکھوں کے شہتیر کے بجائے اپنی آنکھ کے تنکے نظر آئیں گے، دوسروں کے لیے چشم پوشی کا مزاج بنے گا، اور اس کے نتیجہ میں بہتر سے بہتر ماحول پیدا ہوگا، دونوں فریقوں کو بھی صلح کے لیے تقوی اختیار کرنے کی ضرورت ہے اور ثالثی کرنے والے اور صلح صفائی کرانے والے کو بھی تقویٰ کی ضرورت ہے تاکہ وہ جنبہ داری نہ برتے، فیصلہ کرتے وقت اللہ کا لحاظ اور اس کا ڈر ہو۔

مجموعی اعتبار سے اس تقویٰ کے نتیجہ میں جب میل ملاپ کا ماحول بنے گا،

ایک دوسرے کا خیال ہوگا تو یہ چیزیں بھی رحمت الٰہی کو متوجہ کرنے والی ہیں۔

عالمی اخوت اسلامی کی یہ دعوت ہی نہیں بلکہ حقیقت ایمان کا یہ نتیجہ ہے جس کو آیت شریفہ میں بیان کردیا گیا ہے، اور یہ نتیجہ تب ہی ظاہر ہوگا جب ایمان اور ایمان کے تقاضوں کو سمجھ کر ان پر عمل کا جذبہ ہوگا، جب مومن اپنے مومن بھائی کے لیے وہی پسند کرے گا جو اپنے لیے پسند کرتا ہے، جب وہ اپنے مومن بھائی کو نہ رسوا کرے گا نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑے گا، بلکہ اگر ضرورت پڑے گی تو اس کے لیے سِپَر بن جائے گا، یہ ہے وہ ایمانی اخوت کا مضبوط تر رشتہ جس کے نتیجہ میں ایک صحابی نے جان دے دی لیکن اپنے پیاسے ایمانی بھائی سے پہلے خود پانی پینا گوارہ نہ کیا۔(۱)

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰىٓ اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰىٓ اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾

’’اے ایمان والو! کوئی قوم دوسری قوم کی ہنسی نہ اڑائے، ہوسکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کی ہنسی کریں، ہوسکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں، اور ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ اور نہ برے ناموں سے پکارو، ایمان کے بعد فسق بدترین نام ہے، اور جو توبہ نہ کریں وہی ناانصاف ہیں۔‘‘

اصلاح معاشرہ کے قیمتی اصول

قومی عصبیت

موجودہ دور کے فتنوں میں جس فتنہ نے مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر رکھا ہے وہ فتنہ ''قومیت'' کا ہے، یہ کوئی نیا فتنہ نہیں ہے، زمانۂ جاہلیت میں اسی قومیت نے ہزاروں کی جان لی، آدم کی اولاد کو اس نے ٹکڑیوں میں بانٹ دیا، قبائل کی تفصیل و تقسیم اس لیے تھی کہ تعارف وتفاہم کا ذریعہ بنے، لوگوں نے اس کو افتراق کا ذریعہ بنالیا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوا﴾ (اور تمہارے خاندان اور برادریاں بنادیں تا کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔)

ایک رب کے بندے اور ایک باپ کی اولاد، لیکن رنگ ونسل نے ان کے شیرازے کو ایسا منتشر کیا کہ وہ تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئے۔

قومی فخر وغرور اس طرح ان کے اندر داخل ہوگیا تھا کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلوں کی سرعام تحقیر وتذلیل کرتا، اپنے باپ دادا کے مفاخر بیان کرنے کے لیے مجلسیں آراستہ کی جاتیں، اور اس میں دوسروں کی کمزوریاں تلاش کی جاتیں، اور ان کو کم دکھانے کی کوششیں ہوتیں، اس کے نتیجہ میں کبھی کبھی بڑی طویل خوں ریز لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا اور سیکڑوں جانیں تلف ہوجاتیں، لیکن یہ چیزیں ان کے یہاں کچھ معیوب نہ تھیں، بلکہ ان کو قومی مشاغل کا اہم حصہ سمجھا جاتا تھا۔

اسلام کی تعلیم

اسلام نے اس جاہلی نخوت اور بے جا فخر وغرور کو توڑا، ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَى أَنْ يَّكُونُوا

خَیْراً مِّنْھُمْ﴾(۱)

''اے ایمان والو! کوئی قوم دوسری قوم کی ہنسی نہ اڑائے، ہوسکتا ہے کہ وہ (جن کا مذاق اڑایا جارہا ہے) ان سے بہتر ہوں (جو مذاق اڑانے والے ہیں)۔''

آیت شریفہ میں ہر طرح کے قومی تقدس کی نفی کی جارہی ہے اور صاف صاف یہ اشارہ دیا جارہا ہے کہ وجہ امتیاز کسی قوم کا فرد ہونا نہیں ہے، بلکہ امتیاز کی اصل بنیاد وہ صفات ہیں جو ایمان والے کے لیے قرب الٰہی کا ذریعہ ہیں، خیر کا انحصار اسی پر ہے، فضل وکمال کسی قوم کی جاگیر نہیں ہے بلکہ یہ وہ صفات ہیں جو محنت وجستجو کے بعد توفیق الٰہی سے حاصل ہوتی ہیں، اور ان میں بہت سی باطنی کیفیات اور اندرونی حالات وہ ہیں جو ظاہر بین مادی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا تھا، تاہم ہر آدمی اپنی کمزوریوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے، اس کے بعد پھر اس کے لیے کہاں جواز رہ جاتا ہے کہ وہ اپنے بارے میں اور اپنی قوم کے بارے میں بڑائی کے احساس میں مبتلا ہو، اور دوسروں کو حقیر سمجھے، اسی لیے قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ اس کی ممانعت کردی گئی کہ کوئی قوم دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے، اور اس کی نفسیاتی وجہ بھی بیان کردی گئی کہ وہ اپنی بڑائی کے احساس کی جس بنیاد کو لے کر یہ عمل کررہا ہے، ہوسکتا ہے وہ بنیاد ہی کھوکھلی ہو۔

یہاں لفظ ''قوم'' کا استعمال ہوا ہے، اس کے مفہوم میں خاندان اور قبیلہ بھی داخل ہے، جماعت اور گروہ بھی شامل ہے، اور ظاہر ہے جب قبیلہ خاندان اور جماعت کو اس سے روکا جارہا ہے کہ وہ کسی دوسرے خاندان، جماعت یا گروہ کی تحقیر کریں تو کسی ایک فرد کو اس کی اجازت کہاں حاصل ہوسکتی ہے۔

خاص طور پر ''قوم'' کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ زمانۂ جاہلیت کا خاص مرض تھا جس میں وہ مبتلا تھے، جب اخوت اسلامی کی لڑی میں ان کو پرودیا گیا تو اب

نسل وقوم کی تفریق کہاں باقی رہ سکتی تھی، اس کے مفہوم میں فرد واحد بھی داخل ہے، آیت کی رو سے کسی کو بھی وہ فرد ہو یا جماعت ہو یا قبیلہ، اس کا جواز نہیں ہے کہ وہ دوسروں کا مذاق اڑائے۔

آیت کے شانِ نزول میں ایک واقعہ یہ بھی نقل کیا جاتا ہے کہ بنوتمیم کے کچھ لوگوں نے ایک موقع پر ان حضراتِ صحابہؓ کی تحقیر کی تھی، جو کمزور سمجھے جاتے تھے، حضرت بلال حبشیؓ، حضرت صہیب رومیؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، جو سب کے سب دوسرے ملکوں کے تھے، قبائل عرب میں ان کو کوئی خاندانی شناخت نہیں تھی، ان کو نامناسب کلمات کہہ دیئے گئے تھے، اس پر آیت شریفہ میں تنبیہ کی گئی اور سختی سے روک دیا گیا۔(۱)

خواتین سے خطاب

گرچہ ''قوم'' میں خواتین بھی شامل ہیں، اور ممانعت عام ہے، لیکن چونکہ خواتین میں یہ مرض زیادہ ہوتا ہے، ہوسکتا ہے کہ کسی فاسد ذہن میں یہ بات آجائے کہ یہ حکم صرف مردوں کے لیے ہے، اس لیے ان کے بارے میں مستقل وہی بات دہرائی جارہی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِسَاءٍ عَسَى أَنْ يَّكُنَّ خَيْراً مِّنْهُنَّ﴾ (۲)

''اور نہ عورتیں عورتوں کی ہنسی کریں، ہوسکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔''

آیت کا یہ حصہ خواتین کے لیے خاص طور پر قابل غور ہے، سماج میں بگاڑ کا ایک بڑا سبب ان کی بے احتیاطی ہے، جس طرح مردوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ صنف نازک کا خیال رکھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفر کے موقع پر فرمایا تھا: ''رفقاً بالقواریر'' (۱) (ان آبگینوں کا خیال رکھو، کسی کو تکلیف نہ پہنچ جائے)، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر عورتوں کو حق دینے والا کون ہوسکتا ہے؟ اسی طرح

عورتوں کو بھی اس کی تلقین کی گئی ہے کہ وہ خود بھی حق شناس اور احسان شناس بنیں، ایک حدیث میں ان کے جہنم میں جانے کے دو بنیادی اسباب بیان کیے گئے ہیں، ایک طعن کی کثرت اور دوسرے شوہروں کی احسان ناشناسی۔(۲)

آیت شریفہ میں بھی بطور خاص عورتوں کو اسی کی تلقین کی جارہی ہے کہ وہ ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑائیں، اور یہ بات تو کس قدر بے شرمی اور بے احتیاطی کی ہے کہ وہ مردوں کا مذاق بنائیں، اگر وہ شوہر یا باپ ہے تو یہ احسان ناشناسی کی انتہا ہے اور اگر غیر ہے تو بے احتیاطی کے ساتھ بے حیائی بھی ہے۔

''لمز''

اسی آیت شریفہ میں دوسری جس چیز کی ممانعت کی جارہی ہے وہ ''لَـمُـز'' ہے، ''لَـمُـز'' ہر اس کلام یا اشارہ کو کہتے ہیں جس میں مخاطب کی مذمت کی جارہی ہو، چڑھایا جارہا ہو، اور ڈرایا دھمکایا جارہا ہو، کہنے والا جس چیز کو خود معیوب سمجھتا ہو، وہ اس چیز کو مخاطب کی طرف منسوب کرے، وہ عیب مخاطب کے اندر موجود ہو تو بھی اس کا تذکرہ درست نہیں ہے اور وہ عیب مخاطب کے اندر موجود نہ ہو تب تو اس گناہ کی شدت بہت بڑھ جاتی ہے، بعض روایات میں آتا ہے کہ اگر کوئی کسی عیب کو کسی کی طرف منسوب کرتا ہے تو اس وقت تک اس کو موت نہیں آتی جب تک وہ بھی اس عیب میں مبتلا نہ کردیا جائے (۱)، لـمـز کی ممانعت کے لیے جو تعبیر استعمال ہوئی ہے وہ بھی نہایت بلیغ ہے، ارشاد ہوتا:

﴿وَلَا تَلْمِزُوْآ أَنْفُسَكُمْ﴾

''اور ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ۔''

اَنفس، نفس کی جمع ہے، لغوی معنی یہ ہیں کہ اپنی جانوں کو برا مت کہو، اس کے نتیجہ میں تم کو بھی برا کہا جائے گا دوسرا اشارہ اس میں یہ ہے کہ تم جن ایمان والے

بھائیوں کو برا بھلا کہہ رہے ہو، وہ تمہارے بھائی ہیں اور تمہارا ہی حصہ ہیں، ان کو الگ مت سمجھو، ان کو برا بھلا کہنا خود اپنی ذات کو برا کہنا ہے۔

برے ناموں سے پکارنا

تیسری جس چیز سے روکا جارہا ہے وہ برے ناموں سے پکارنا ہے، فرمایا جارہا ہے:

﴿وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ﴾ (۲)

''اور نہ برے ناموں سے پکارو۔''

جن القاب کو معیوب سمجھا جاتا ہو، ان سے احتیاط کرنی چاہیے، القاب کبھی خلقی نقص کی بناء پر پڑجاتے ہیں، جیسے اندھا، کانا، بہرا، نکٹا وغیرہ، ظاہر ہے جس کو ان ناموں سے پکارا جائے گا اس کو کس قدر تکلیف ہوگی، کبھی بری عادتوں کی وجہ سے نام پڑجاتے ہیں، کسی نے چوری کی، اس کو چور کہا جانے لگا، وہ تائب ہوگیا، پرہیز گار بن گیا، تب بھی اس کو چور کہا جارہا ہے، کوئی بھی ایسا لقب یا نام جس سے مخاطب تکلیف محسوس کرے، اس سے بچنا چاہیے، حدیث میں آتا ہے کہ مسلمان کو تکلیف پہنچانا حرام ہے۔(۱) کسی بھی قول سے، فعل سے، طرز گفتگو سے تکلیف پہنچ سکتی ہو، اس سے بچنا ضروری ہے۔

بندوں کے حقوق

یہ بات یادرکھنے کی ہے کہ حقوق دوطرح کے ہیں: ایک حق اللہ کا ہے اور دوسرا حق بندوں کا ہے، اللہ تعالیٰ توبہ پسند فرماتے ہیں، اپنے حق میں وہ معاف فرمادیں گے، لیکن بندوں کا حق اس وقت تک معاف ہونا مشکل ہے جب تک معاف نہ کرالیا جائے، اگر گناہ حقوق العباد سے متعلق ہے تو اس گناہ کی توبہ قبول ہی اس وقت ہوگی

جب حق ادا ہو جائے یا اس کی معافی کرائی جائے، یہ توبہ کے شرائط میں سے ہے۔

ہمارے معاشرہ کا یہ سب سے بڑا مرض ہے جو ہم مسلمانوں کو گھن کی طرح لگ گیا ہے، بالائے ستم یہ کہ اس کو مرض نہیں سمجھا جاتا، اچھے اچھے دیندار لوگ اس میں مبتلاء ہو جاتے ہیں، اس سے مسلمانوں کی بہت غلط تصویر انسانی سماج میں جا رہی ہے، اخلاقیات اور معاملات میں کھوکھلا پن بڑھتا چلا جا رہا ہے، مسلمانوں کے لیے یہ بڑا لمحۂ فکریہ ہے، اس کی اصلاح کی شدید ضرورت ہے، تا کہ اسلامی معاشرہ مکمل اسلام کی تصویر بن سکے۔

جب آیت شریفہ میں استہزاء کرنے، برا بھلا کہنے اور برے ناموں سے پکارنے کی ممانعت ہے تو حق مارنا کس درجہ گناہ کی بات ہوگی، ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے پوچھا: جانتے ہو مفلس کون ہے؟ انھوں نے کہا جس کے پاس درہم و دینار نہ ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مفلس وہ نہیں ہے (جس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو) مفلس تو وہ ہے جو قیامت کے دن نیکیاں لے کر آئے گا، لیکن کسی کو ستایا ہوگا، کسی کا حق مارا ہوگا، کسی کو گالی دی ہوگی، ان تمام لوگوں کو اس کی نیکیاں دے دی جائیں گی، اور جب نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو ان لوگوں کی برائیاں اس کے سر ڈالی جائیں گی، اور پھر (ہزاروں نیکیوں کے باوجود) اس کو منھ کے بل کھینچ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔(۱)

زبان کی خرابیاں

زبان کا استعمال آدمی آسانی سے کر لیتا ہے، اور اس کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس سے کتنے دل دکھے، کتنوں پر زد پڑی، کہاں کہاں معاملات بنتے بنتے بگڑ گئے، آیت شریفہ میں جن باتوں سے روکا جا رہا ہے، ان میں زیادہ تر زبان کی بے احتیاطیاں اور برائیاں ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ زبان کے استعمال میں آدمی کو باک

نہیں ہوتا، وہ اکثر سوچ ہی نہیں پاتا کہ اس کے نتائج کیا نکلیں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آدمی بعض مرتبہ دیکھنے میں معمولی سی بات زبان سے نکالتا ہے، وہ اس کو تحت الثریٰ میں پہنچا دیتی ہے، معاشرہ کے بگاڑ میں زبان کا سب سے بڑا دخل ہے، بعض مرتبہ اس کا گھاؤ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ اس کا بھرنا آسان نہیں ہوتا، ایک عرب شاعر کہتا ہے: ؎

جراحات السنان لها التيام

ولا يلتام ما جرح اللسان

(نیزوں کے زخم بھرے جا سکتے ہیں، لیکن جو زخم زبان سے لگتا ہے وہ بھرا نہیں جا سکتا۔)

زبان کے بے جا استعمال سے آدمی خود مصیبت مول لیتا ہے، عمومی طور پر پریشانیوں کا سبب یہی ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ صاف صاف فرماتے ہیں: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِيْداً يُّصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ (۱) (اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اور جچی تلی بات کہو، اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو بنا دے گا اور گناہوں کو معاف کر دے گا۔)

ایک حدیث میں آتا ہے کہ تم دو چیزوں کی ضمانت لے لو، میں تمہارے لیے جنت کی ضمانت لیتا ہوں؛ الفم والفرج (۲) (منھ اور شرم گاہ) ایک دوسری حدیث میں فرمایا: "وهل يكبّ الناس على وجوههم إلا حصائد ألسنتهم" (۳) (لوگوں کو جہنم میں منھ کے بل ان کی زبان کے کرتوت ہی لے جائیں گے)۔

حدیث کی یہ نہایت ہی بلیغ تعبیر ہے، حصیدة کی جمع حصائد ہے، حصائد کٹی ہوئی کھیتی کو کہتے ہیں، درانتی یا ہنسیا سے جب کھیتی کاٹی جاتی ہے، تو غلہ کے ساتھ جنگلی گھاس بھی اس میں آجاتی ہے، اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کیڑے

مکوڑے بھی درمیان میں پھنس کر کٹ جاتے ہیں، کاٹنے والا اپنا عمل جاری رکھتا ہے، یہی زبان کا حال ہوتا ہے، جو لوگ بغیر دیکھے بھالے، سوچے سمجھے، اس کا استعمال کرتے ہیں، وہ بعض فائدوں کے ساتھ اپنا کتنا نقصان کر لیتے ہیں، اس کا اندازہ ان کو نتائج نکلنے کے بعد ہوتا ہے، اور بہت سے نتائج تو آخرت پر موقوف ہیں، اسی لیے قرآن وحدیث میں بار بار اس کی تاکید کی گئی ہے کہ زبان کا استعمال احتیاط کے ساتھ کیا جائے، ایک حدیث میں آتا ہے: "من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فيلقل خيرا أو ليصمت" (۱) (جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، وہ بھلی بات کہے ورنہ خاموش رہے۔)

ہزار خرابیوں کی جڑ یہ زبان ہے، آدمی بعض مرتبہ کچھ نہیں تو اپنی تعریف ہی شروع کر دیتا ہے، اور اس کے اندر تعلّی کا احساس شامل ہو جاتا ہے، جو اس کو نقصان پہنچاتا ہے، حاصل یہ ہے کہ تحفظ کے ساتھ زبان کا استعمال ہوگا تو بچنے کی امید ہے، ورنہ خطرہ ہی خطرہ ہے، آیت شریفہ میں اسی لیے بڑی تاکید کے ساتھ یہ احکامات دیئے گئے ہیں تاکہ زبان سے کوئی تکلیف کسی کو نہ پہنچے۔

بدترین بات

فسق اللہ کے حکم سے سرتابی کو کہتے ہیں، زبان کے غلط استعمال سے ممانعت کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

﴿بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْإِيْمَانِ﴾ (۲)

"ایمان کے بعد فسق بدترین نام ہے۔"

اس میں صاف صاف یہ اشارہ ہے کہ اوپر جن منہیات کا ذکر تھا وہ سب فسق میں شامل ہیں، ایک حدیث میں آتا ہے: "سباب المؤمن فسوق" (۳) (مومن کو گالی دینا فسق کی بات ہے)، اسم اپنے مسمّٰی پر دلالت کرتا ہے، جہاں کسی چیز

کا نام لیا جاتا ہے، وہاں اس کا چرچا ہوتا ہے، اس میں بظاہر یہ اشارہ ہے کہ ایمان کے ٹھپہ لگ جانے کے بعد لوگوں میں اس کا چرچا ہوجانے کے بعد پھر فسق کا چرچا ہو، یہ ایمان کے تقاضے کے خلاف ہے، اور اس سے اسلام پر زد پڑتی ہے، عام لوگ فرق نہیں کر پاتے، جب وہ مسلمان میں کسی صفت کو دیکھتے ہیں تو وہ اس کو اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں، کسی مسلمان کے فعل سے اسلام پر زد پڑے اور اس کا یہ عمل دعوت اسلام کے لیے روڑا بنے، اس سے بڑھ کر برائی کیا ہوسکتی ہے؟

اور پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دولت ایمان سے سرفراز فرمایا، اخلاق کی بلندی عطا فرمائی، ایسی پاکیزہ تعلیمات دیں جو نہ کسی مذہب میں مل سکتی ہیں اور نہ کسی تہذیب میں، اس کے بعد پھر آدمی سرتابی کرے، ان تعلیمات کی ناقدری کرے، تو یہ بدترین بات ہے، ترقی کے بعد تنزلی، روشنی کے بعد تاریکی، علم کے بعد جہالت، ایمان کے بعد فسق و فجور، اس کو سوائے بے توفیقی کے اور کس چیز سے تعبیر کیا جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں سے پناہ مانگی، ان میں یہ بھی ہے: "أعوذ بك من الحور بعد الكور" (۱) (اے اللہ تاج سعادت دے کر پھر اس سے محروم نہ فرمانا) "کور" عمامہ کے پیچ کو کہتے ہیں، اور "حور" اس کے کھل جانے کو کہتے ہیں۔

توبہ کی قیمت

بڑے سے بڑے سرکش، کافر اور گنہگار کے لیے بھی اللہ نے دروازہ بند نہیں کیا، جب تک جان میں جان ہے، دروازہ کھلا ہوا ہے، اگر ان ہزار خرابیوں کے بعد بھی بندہ مالک کی طرف لوٹ جائے، توبہ کرلے، تو اللہ تعالیٰ سب کو معاف کردیتے ہیں: ﴿إِنَّهُ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعاً إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾ (۲) (وہ تمام گناہوں کو معاف کرنے والا اور نہایت رحم والا ہے۔) ہاں اگر کوئی عناد پر کمر بستہ ہے اور

رجوع نہ کرے تو اس کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ.﴾(۱)

''اور جو توبہ نہ کریں وہی ناانصاف ہیں۔''

کوتاہی کا احساس بڑی چیز ہے، اپنی غلطی کو غلطی سمجھنا معمولی بات نہیں، غلط راستہ پر پڑ جانے کے بعد اگر اپنی غلطی کا ادراک ہو گیا تو آدمی واپس آ سکتا ہے، صبح کا بھولا شام کو اگر گھر آ جائے تو اس کو بھولا نہیں کہتے، لیکن اگر راستہ بھٹک جانے کے بعد احساس ہی نہ رہے تو آدمی کہاں سے کہاں پہنچ جائے، اور پھر اس کو منزل ہی نہ مل سکے، اسی لیے فرمایا کہ جو توبہ نہیں کرتا وہی ناانصاف ہے، نہ اس نے اپنے حق کو سمجھا اور نہ دوسروں کے حق کا احساس رہا، اسی لیے کہا جا رہا ہے کہ ظالم تو یہی لوگ ہیں۔

علماء نے توبہ کی تین بنیادی شرطیں کتاب وسنت کی روشنی میں بیان کی ہیں:

۱- گناہ فوراً چھوڑ دے۔ ۲- احساس ندامت پیدا ہو۔ ۳- دوبارہ گناہ نہ کرنے کا عزم ہو۔ ۴- جو گناہ حقوق العباد سے متعلق ہیں، ان میں چوتھی شرط بھی ضروری ہے کہ اگر اس نے حق ادا نہیں کیا ہے تو ادا کرے، مثلاً کسی کی امانت اس کے پاس ہے، امانت رکھنے والا تقاضہ کر رہا ہے تو بغیر تاخیر کے ادا کر دے، میراث میں کسی اور کا بھی حق رہا ہے تو حساب لگا کر اس کا حصہ اس کو دیدے، کاروبار میں اگر شرکت ہے تو ہر شریک کو اس کا حق ملنا چاہیے، غرض ایک پیسہ بھی اگر دوسرے کا اپنے مال میں شامل ہو گیا تو وہ گویا قطرۂ نجس ہے جو پورے مال کو نجس کر رہا ہے، جتنی جلد ممکن ہو اس کو صاحبِ حق تک پہنچا کر اپنے مال کو پاک کر لیا جائے۔

﴿یٰٓأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اجْتَنِبُوْا كَثِیْراً مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضاً أَیُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ یَّأْكُلَ لَحْمَ أَخِیْهِ مَیْتاً فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوْا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ﴾

”اے ایمان والو! اکثر گمانوں سے بچو، بلاشبہ بعض گمان گناہ ہیں، اور نہ ٹوہ میں رہو اور نہ ایک دوسرے کی غیبت کرو، کیا تم میں کسی کو اچھا لگے گا کہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے، اس سے تو تم گھن کرو گے ہی، اور اللہ سے ڈرو، بلاشبہ اللہ توبہ قبول فرماتا ہے، رحم فرماتا ہے۔“

سماج کی تین بیماریاں

مریض سماج کی فکر

سماج کے سدھار کے لیے آج جگہ جگہ پروگرام ترتیب دیئے جارہے ہیں، کارنرمیٹنگوں کا سلسلہ بھی جاری ہے، یہ ایک قابل ستائش اقدام ہے، اصلاح معاشرہ کی سب سے بڑی ذمہ داری مسلمانوں کی ہے، ان کے پاس اس کا پورا لائحۂ عمل موجود ہے، ان کی اس سلسلہ کی تمام کوششیں ضروری ہیں اور قابل تعریف ہیں، لیکن ان کوششوں کے جو مثبت نتائج سامنے آنے چاہئیں، بڑی حد تک وہ نتائج سامنے نہیں آتے، شاید اس کا سبب یہ ہے کہ اندر سے جو روگ سماج کو لگ گئے ہیں ان کے علاج کی فکر کم سے کم کی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر وبیشتر یہ کوششیں نقش برآب ثابت ہوتی ہیں۔

معاشرہ افراد سے وجود میں آتا ہے، اس کی اصلاح افراد کے صلاح سے وابستہ ہے، لوگوں میں اگر کوئی متعدی مرض پیدا ہوجائے تو وہ پورے معاشرہ کو متعفن کردیتا ہے، بعض مرتبہ ایک فرد کی بیماری پورے معاشرہ کو اپنے لپیٹ میں لے لیتی ہے، اس لیے اصلاح معاشرہ کی سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ معاشرہ کا ایک ایک فرد اپنا جائزہ لے اور کم سے کم وہ بیماریاں جن کے اثرات دوسرں پر بھی پڑتے ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے، ان میں تین بنیادی امراض ہیں جن سے پورا معاشرہ لپیٹ ہورہا ہے، سورۃ الحجرات کی بارہویں آیت میں بطور خاص ان تینوں کو بیان کیا گیا ہے۔

گیارہویں آیت میں ان تین بیماریوں کا ذکر تھا جن کی تشخیص آسان تھی، ان کو آسانی سے گرفت میں لایا جاسکتا تھا، اور اس آیت میں جن تین بیماریوں کا ذکر ہے وہ اندر کی بیماریاں ہیں، بعض مرتبہ ان کا احساس بھی مشکل ہوتا ہے اور ان کے

علاج میں بھی دشواری پیش آتی ہے، اس لیے ان کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے تاکہ یہ روگ جو معاشرہ کو لگ چکا ہے وہ زیادہ بڑھنے نہ پائے اور کسی ایسے خطرناک مرض کی شکل نہ اختیار کرلے جو لاعلاج ہو جائے۔

بدگمانی

ان تین مہلک بیماریوں میں پہلا مرض ''بدگمانی'' ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيراً مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ﴾ (۱)

''اے ایمان والو! اکثر گمانوں سے بچو، بلاشبہ بعض گمان گناہ ہیں۔''

یہ بات انسان کی نفسیات میں داخل ہے کہ وہ عام طور پر جلدی بدگمان ہو جاتا ہے، برے خیالات اس کو گھیر لیتے ہیں، کسی کے بارے میں اچھا گمان کرنا اس کے لیے قدرے مشکل ہوتا ہے، آیت شریفہ میں اسی لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ اکثر گمان سے بچو پھر اس کی وجہ بیان فرمادی کہ بعض گمان گناہ کی حد تک پہونچ جاتے ہیں، کسی کے بارے میں اچھا گمان کرنا آدمی کے لیے عام طور پر نقصان دہ نہیں ہوتا لیکن بدگمانی کے اثرات بعض مرتبہ بہت ہی سخت ہوتے ہیں اسی لیے بہتر یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی کے بارے میں معلومات پوری طرح نہ ہوں تو اس کے بارے میں اچھا گمان رکھے، کسی برے شخص کے بارے میں اگر اچھا گمان ہے تو قیامت میں یہ سوال نہیں ہوگا کہ تو نے برے کو اچھا کیوں سمجھا لیکن اگر کسی اچھے شخص کے بارے میں برا گمان ہے تو قیامت میں اس کی گرفت ہوگی، تاہم اچھا گمان رکھنے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ بغیر تحقیق کے اس سے معاملات شروع کردے۔

تحقیق کی ضرورت

اگر اچھے گمان کے نتیجہ میں اس سے معاملہ کیا اور وہ فی نفسہٖ اچھا انسان نہ ہوا

تو معاملہ کرنے والا دھوکہ کھا سکتا ہے، دھوکہ دینا تو بدترین گناہ ہے ہی دھوکہ کھانا بھی فراست ایمانی کے منافی ہے، حدیث میں آتا ہے "لا یلدغ المؤمن من جحر واحد مرتین" (۱) (مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جا سکتا) اگر ایک مرتبہ دھوکہ ہو بھی جائے تو دوسری مرتبہ وہ دھوکہ نہیں کھاتا، اسی طرح اگر کسی سے دینی مسائل میں استفادہ کرنا ہے تو بھی بہتر یہی ہے کہ اس کے بارے میں اچھی طرح سے معلومات حاصل کر لی جائیں اور اچھی طرح پرکھ لیا جائے، قرون اولیٰ میں یہ مقولہ لوگوں کی زبان پر تھا: "إن هذا العلم دين فانظروا عمن تأخذون دينكم."(۲) (یہ علم دین ہے تو اچھی طرح دیکھ لو کہ تم دین کس سے حاصل کر رہے ہو۔)

کسی سے اگر معاملہ کرنا ہو، وہ معاملہ دنیوی ہو یا دینی اس سے فوراً خوش اعتقاد ہو جانا اور بغیر تحقیق کے اچھا گمان کر کے معاملہ کر لینا بھی دینی مزاج کے خلاف ہے اور بعض مرتبہ اس کے بڑے نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں، اس لیے سب سے بہتر شکل یہ ہے کہ عام طور پر لوگوں کے ساتھ اچھا گمان رکھا جائے لیکن اگر کسی قسم کا لین دین کرنا ہو یا دین حاصل کرنا ہو تو جب تک اچھی طرح تحقیق نہ کر لی جائے اس وقت تک معاملہ نہ کیا جائے اور نہ ہی کسی دوسرے کے سامنے اس کی گواہی دی جائے تاکہ کوئی دوسرا بھی دھوکہ میں نہ پڑے، کسی نے حضرت عمرؓ کے سامنے کسی کی تعریف کی تو حضرت عمر نے فرمایا کہ تم یہ بات یقینی طور پر کیسے کہہ رہے ہو، کیا تمہیں اس سے کسی لین دین کا سابقہ پڑا ہے یا تم نے اس کے ساتھ طویل عرصہ گذارا ہے؟ (۱) بغیر اس کے تم کسی کے بارے میں یقین کے ساتھ ایسی بات کیسے کہہ سکتے ہو!

یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ دو باتیں الگ الگ ہیں، اچھا گمان کرنا الگ بات ہے لیکن اس کی بنا پر معاملہ کر لینا الگ بات ہے، جب تک برائی کا علم یقینی طور پر نہ ہو جائے اس وقت تک اچھا گمان رکھنے کا حکم ہے، لیکن بغیر تحقیق کے معاملہ کر لینے میں

نقصان کے خطرات ہیں۔امام ابوداوٗدؒ،حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "حسن الظن من حسن العبادة."(۲) (اچھا گمان کرنا اچھی عبادت میں سے ہے)۔

بدگمانی کے نقصانات

اگر ناحق بدگمانی کی ہے تو یہ اس کے حق میں وبال ہے،اوراس کے بارے میں سخت سے سخت روایات وارد ہیں،اس کے نقصانات دنیا میں بھی بہت ہیں،بعض مرتبہ بدگمانی کی بنا پر انسان بہت کچھ خیر سے محروم رہتا ہے،عالم کو جاہل سمجھ رہا ہے تو اس کے علم سے محروم ہوگا،کوئی ایسا شخص جو اس کی صحیح رہنمائی کرسکتا ہے اس کو صحیح راستہ بتا سکتا ہے اس کو وہ گمراہ سمجھ رہا ہے اور بغیر تحقیق کے اس سے بدگمانی کا شکار ہے تو وہ اس کی رہنمائی سے محروم رہے گا،کوئی بھی اس کو نفع پہونچانے کی صلاحیت رکھتا ہے اس کا خیر خواہ ہے لیکن وہ اس کے بارے میں بدگمان ہے تو اس کے ہر طرح کے فائدے سے دور رہے گا۔

بدگمانی کی مذکورہ بالا شکلیں تو وہ ہیں کہ جن کا نقصان انفرادی طور پر خود بدگمانی کرنے والے کو ہو رہا ہے،لیکن عام طور پر بدگمانی کرنے والا اقدام اور انتقام پر آمادہ ہو جاتا ہے،اس کے نتائج پورے معاشرہ کو بھگتنے پڑتے ہیں،بدگمانی کی جو بھی نوعیت ہو اس کے اعتبار سے بدگمانی کرنے والا آگے بڑھتا ہے،اور بات قتل و غارت گری تک پہنچ جاتی ہے،اس میں عام طور پر غلط فہمیوں کو دخل ہوتا ہے،آدمی کسی کے بارے میں کوئی بات سن کر یا کچھ دیکھ کر ایک رائے قائم کرلیتا ہے،اس کے بعد بات بڑھتے بڑھتے کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے،اس مرض کے نقصانات محدود نہیں رہتے عام طور پر متعدی ہوتے ہیں،اسی لیے اس کی سخت نکیر کی گئی ہے اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں میں خیر کا پہلو تلاش کیا جائے،حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ اگر تمہارا مومن بھائی

کوئی بات کہتا ہے اور اس کو خیر پر محمول کیا جا سکتا ہے تو تم برا خیال مت لاؤ اور اس کو خیر ہی پر محمول کرو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دسیوں حدیثیں منقول ہیں جن میں بدگمانی سے روکا گیا ہے، ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إياكم والظن فإن الظن أكذب الحديث" (۱) (بدگمانی سے بچو اس لیے کہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے)۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کو خطاب کر کے فرمایا: تو کیا خوب ہے اور تیری خوشبو بھی کیسی پاکیزہ تر ہے، تو کیسا عظیم ہے اور تیری حرمت کیسی عظیم تر ہے، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے، ایک مومن کی حرمت تجھ سے بڑھ کر ہے، اس کا خون اور اس کا مال، اور یہ کہ اس کے بارے میں اچھا ہی گمان کیا جائے۔(۲)

بدگمانی کا علاج

اگر کسی کے بارے میں برے خیالات پیدا ہوں اور بدگمانی کی صورت پیدا ہو جائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا علاج بھی ایک حدیث میں تجویز فرمایا ہے، آپ فرماتے ہیں: ''تین چیزیں میری امت کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتیں، فال، حسد اور بدگمانی۔'' سوال کیا گیا کہ ان کے برے نتائج سے کیسے حفاظت ممکن ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر حسد پیدا ہو جائے تو اللہ سے استغفار کرو، اگر بدگمانی پیدا ہو تو عمل اس کے مطابق نہ کرو (اور اس کو ذہن سے نکال دو)، اگر فال ہو تو بھی فال بد کی وجہ سے عمل ترک مت کرو۔'' (۱)

کسی کے بارے میں محض خیالات کا آجانا قابل مواخذہ نہیں ہے، ایک حدیث میں آتا ہے: "إن اللّٰه تجاوز عن أمتي ما وسوست به صدورها ما لم

تعمل أو تکلم" (۲) (اللہ تعالیٰ نے میری امت کے وسوسوں کو معاف کردیا جب تک وہ وسوسوں کی حد تک رہیں اوران کو دور کیا جاتا رہے) اگراس پرعمل شروع ہو گیا اور گفتگو کی جانے لگی اور ذہن میں وہ چیز بیٹھنے لگی تو اس پر مواخذہ ہوگا اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا علاج یہ بتایا ہے کہ اگر برے گمان پیدا ہونے لگیں تو ان کو باقی نہ رکھا جائے۔

حسن ظن

یہ مرض عام طور پر ہم مسلمانوں میں پیدا ہو گیا ہے کہ دوسروں کے معائب پر نگاہ رہتی ہے اور ذرا سی بات بھی بہت بڑی نظر آتی ہے، یہ مثل پوری طرح ہم پر صادق آتی ہے کہ اپنی آنکھوں کے شہتیر نظر نہیں آتے لیکن دوسروں کی نگاہوں کے تنکے نظر آجاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک مرتبہ کسی کا ذکر آیا تو بعض لوگوں نے جو واقفیت رکھنے والے تھے ان کے بارے میں کہا کہ وہ بڑے گناہوں میں مبتلا ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس کو اللہ اوراس کے رسول سے محبت ہے۔" (۱) بڑے گناہوں کے پائے جانے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ایک نیکی کا ذکر فرمایا اور یہ سبق دے دیا کہ مجلسوں میں اس طرح اگر کسی کا ذکر آئے تو ذکرِ خیر ہی بہتر ہے، بعض مرتبہ ایک نیکی اللہ کی بارگاہ میں ایسی قبول ہو جاتی ہے کہ بڑے بڑے گناہوں پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے، بدگمانی کرنے والے کے اندر عام طور پر اپنی بڑائی کا احساس بھی پیدا ہونے لگتا ہے اور یہ چیز اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے، مسئلہ صرف بدگمانی ہی کا نہیں بلکہ اگر کسی کے اندر خرابی موجود ہے اوراس کی نکیر کرنی ہے تو بھی اگر ایسا کوئی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جس میں اپنی بڑائی کا اظہار ہوتا ہو، تو اللہ کی ذات بہت غنی ہے معاملہ بالکل الٹ سکتا ہے، ایک حدیث میں دو دوستوں کا واقعہ بیان ہوا ہے، ان میں سے ایک متقی پرہیزگار تھا دوسرا برائیوں

میں مبتلا ہوجایا کرتا تھا، اس کا نیک دوست اس کو سمجھاتا رہتا تھا مگر اس سے برائیاں چھوٹتی نہ تھیں، ایک دن غصہ میں آکر اس کا نیک دوست کہنے لگا تو جنت میں کبھی نہیں جاسکتا، تیرا ٹھکانہ تو جہنم ہی ہے، اللہ تعالیٰ کو اس کی یہ بات پسند نہیں آئی اور اللہ تعالیٰ نے اس سے کہا کہ تو کون ہوتا ہے اس کو جنت سے روکنے والا، میں تجھے جہنم میں بھیج دوں گا اور اس کو جنت میں داخل کروں گا۔(۲)

یہ تو ایک واقعہ تھا مسئلہ صرف بدگمانی کا تھا، اس پر اتنی سخت پکڑ ہوگئی، اگر صرف بدگمانی کی بنا پر کسی کو ذلیل اور کمتر سمجھا گیا اور اپنے قول وفعل سے اس کا اظہار بھی کیا گیا تو کیسے سخت گناہ کی بات ہے، اور پھر جب اس کے بدترین نتائج معاشرہ کے سامنے آئیں گے تو معاشرہ کیسا کرپٹ ہوتا چلا جائے گا یہ ہر تجزیہ کرنے والا سمجھ سکتا ہے۔

تین بیماریوں میں سے یہ وہ پہلی بدترین بیماری ہے جو ایک روگ کی طرح امت کو لگ گئی ہے، امت کی وحدت کو یہ گھن کی طرح چاٹتی چلی جارہی ہے، آیت شریفہ میں اس کے بعد جن دو بیماریوں کا ذکر ہے وہ بھی اکثر وبیشتر اسی پہلی بیماری کے نتیجہ میں پیدا ہوجاتی ہیں۔

تجسس

دوسری بیماری جس کا آیت شریفہ میں ذکر ہے وہ تجسس ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَّلَا تَجَسَّسُوْا﴾

’’اور نہ ٹوہ میں رہو۔‘‘

آدمی جب کسی سے بدگمان ہوتا ہے تو اس کی ٹوہ میں پڑتا ہے، اس کی نقل وحرکت پر اس کی نگاہ ہوتی ہے، اس کے پیچھے وہ اپنے جاسوس لگادیتا ہے، اور پھر اس

کی اچھائیاں بھی اس کو برائیوں کی شکل میں نظر آنے لگتی ہیں، جاسوس، تجسس ہی سے بنا ہے، بڑے پیمانہ پر جب یہ کام ہوتا ہے تو جاسوسی کا پورا نظام شروع ہوجاتا ہے، کسی ایمان والے فرد یا جماعت کے لیے درست نہیں کہ وہ اپنے ایمانی بھائیوں کے عیوب تلاش کرے، عیوب ہر ایک کے اندر ہوتے ہیں، کسی کے اندر معمولی اور کسی کے اندر زیادہ، اسلامی حکم یہ ہے کہ آدمی عیوب سے چشم پوشی کرے اور بھلائیوں سے فائدہ اٹھائے، ہاں ان لوگوں کے لیے جو خدا کے باغی ہیں اور اسلام کے دشمن ہیں، ان کے مکائد سے مطلع ہونے کے لیے جاسوسی کرنا یا کرانا جنگی حکمت عملی ہے تاکہ ان کی کمزوریوں سے واقف ہوکر ان پر قابو پایا جاسکے، اور دنیا کو ان کے شر سے بچایا جاسکے۔

ایمان والے تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، امیر ہو یا غریب، چھوٹا ہو یا بڑا، عبادت گذار اور شب بیدار ہو یا گناہ گار، وہ ایک دوسرے کی کرید میں نہیں پڑتے، ہر ایک کے لیے خیرخواہی کرنا ان کا مزاج ہوگا، یہ امت کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت ہے، وہ کسی کو نیچا دکھانے کا خیال بھی دل میں نہیں لاتے، دوسروں کے لیے وہ وہی پسند کرتے ہیں جو اپنے لیے پسند کرتے ہیں، وہ دوسروں کی برائیاں تلاش نہیں کرتے اور اگر کوئی برائی سامنے آجاتی ہے تو اس کے اندر اصلاح کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، کسی کی تحقیر وتذلیل کا خیال بھی اس کے ذہن میں نہیں آتا، مشہور حدیث ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امت کے افراد کو خطاب کرکے فرماتے ہیں: "إیاکم والظن فإن الظن أکذب الحدیث ولا تحسسوا ولا تجسسوا ولا تنافسوا ولا تحاسدوا ولا تباغضوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللہ إخوانا." (۱) (بدگمانی سے بچو، اس لیے کہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے، نہ تجسس میں پڑو، نہ ٹوہ میں لگو اور نہ (دنیا میں) منافست کرو، نہ ایک دوسرے سے حسد کرو، نہ بغض کرو اور نہ

منھ موڑ و اور اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی ہو کر رہو)۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: "إنك إن اتبعت عورات الناس أفسدتهم أو كدت أن تفسدهم." (۲) (اگر تم لوگوں کے پوشیدہ معائب کے پیچھے پڑو گے تو ان کو بگاڑ ہی دو گے یا بگاڑ کے قریب پہنچا دو گے۔)

ایک دوسری حدیث امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے نقل کی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: "إن الأمير إذا ابتغى الريبة في الناس أفسدهم." (۱) (امیر جب لوگوں میں شبہ کی باتیں تلاش کرے گا تو ان کو بگاڑ کر چھوڑے گا۔)

حدیثوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو برائیاں کھلی ہوئی ہوں ان پر نکیر کی جائے اور کھل کر ان سے روکا جائے لیکن جن برائیوں کا لوگوں کو علم نہیں ان کو کرید کرید کر عام نہ کیا جائے، اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ وہ برائیاں پھیلنے لگتی ہیں، سماج میں بگاڑ پیدا ہونے لگتا ہے، اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ "كل أمتي معافى إلا المجاهرين." (۲) (میری کل امت کو معاف کیا جائے گا سوائے ان لوگوں کے جو گناہوں کا چرچا کرتے ہیں۔) جب حدیث میں اپنے گناہوں کو چھپانے کا حکم ہے تو دوسروں کے معائب کو اچھالنے کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے، اسی لیے ہر ایک کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ دوسروں کی ٹوہ میں رہے اور نہ اس کے اندرونی حالات کے جاننے کا چکر چلائے۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لے گئے اور بلند آواز سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "يا معشر من قد أسلم بلسانه ولم يفض الإيمان في قلوبه لا تؤذوا المسلمين ولا تعيروهم ولا

تتبعوا عوراتهم فإن من تتبع عورة أخيه المسلم تتبع الله عورته و من تتبع الله عورته يفضحه ولو في جوف رحله." (۳) (اے وہ لوگو! جو زبان سے تو اسلام لے آئے ہو لیکن دلوں میں اسلام نہیں اتر سکا، مسلمانوں کو ایذاء نہ پہنچاؤ، ان کو عار مت دلاؤ، اور ان کے عیوب کے پیچھے نہ پڑو، جو بھی اپنے (مسلمان) بھائی کے عیب کے پیچھے پڑے گا اللہ تعالیٰ اس کے عیب کے پیچھے پڑے گا اور اللہ تعالیٰ اگر کسی کے عیب کے پیچھے لگ جائے تو اس کو رسوا کر کے چھوڑے گا خواہ وہ کجاوے کے اندر ہی (چھپا) کیوں نہ ہو۔)

اس حدیث سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کے عیوب کی تلاش میں وہی لوگ پڑتے ہیں جو دل کے مریض ہوتے ہیں، ایمان کے حقیقی نور سے ان کے دل خالی ہوتے ہیں، اللہ کو اپنے مومن بندوں سے پیار ہے، اگر کوئی ان کو ایذاء پہنچاتا ہے بے ضرورت عار دلا کر، ان کے پوشیدہ عیوب کے پیچھے لگ کر، تو اللہ تعالیٰ بھی ایسے شخص کو نہیں چھوڑتے: "الجزاء من جنس العمل" (جیسی کرنی ویسی بھرنی)، جو دوسروں کو ذلیل کرنے کی مذموم کوشش کرے گا وہ اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا، اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کر کے چھوڑیں گے۔

ایک حدیث میں ناحق کسی مسلمان کی بے آبروئی کو بدترین سود قرار دیا گیا (۱)، اس کے بالکل برخلاف اگر کوئی عیوب کی پردہ پوشی کرتا ہے، اول تو عیوب کی تلاش میں نہیں رہتا اور اگر کبھی کسی کی برائی پر نگاہ پڑ بھی جاتی ہے تو وہ اس کو اچھالتا نہیں اور اس کی عزت سے کھلواڑ نہیں کرتا، تو اس کے لیے بڑے اجر کی بات ہے، آج وہ اپنے مسلمان بھائی کی پردہ پوشی کر رہا ہے، کل قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں پر پردہ ڈال دیں گے، حدیث میں آتا ہے: "من ستر مسلماً ستره الله في الدنيا والآخرة." (۲) (جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس

کے ساتھ ستاری فرمائیں گے، ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوتا ہے: "من رأى عورة فسترها كان كمن أحيا موؤدة." (۱) (اگر کسی کی نگاہ کسی کے پوشیدہ عیب پر پڑ گئی اور اس نے اس کو چھپالیا، اس نے (گویا) زندہ در گور لڑکی کو زندگی بخشی۔)

حدیث میں بڑی حکیمانہ تعبیر اختیار کی گئی ہے، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اگر کسی کی برائی اچھال دی گئی تو اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ وہ مرد یا عورت کسی قابل نہیں رہ جائے گی، گویا کہ اس کی جان ہی نکال لی گئی، دوسرا اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ پھر ان کے اندر مزید برائیوں کے پیدا ہوجانے کا اندیشہ ہوتا ہے، وہ سوچتے ہیں کہ جب ایک تہمت لگ ہی گئی تو اب کس کا ڈر، عرف اور معاشرہ کا دباؤ بھی بڑی چیز ہے، جب یہ بھی ختم ہوجاتا ہے تو کبھی کبھی آدمی برائیوں کا پیکر بن جاتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں معاشرہ میں ایک ناسور وجود میں آجاتا ہے، اب اگر کوئی ایسی برائی دیکھ کر اس پر پردہ ڈال رہا ہے تو گویا وہ اس برائی کرنے والے کو ایک نئی زندگی دے رہا ہے اور اس کو سنبھلنے کا دوبارہ موقع مل رہا ہے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ گویا اس نے زندہ در گور کو زندگی دی۔

یہاں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ برائیوں کو دیکھ کر ان کی پردہ پوشی کرنا اور لوگوں سے ان کو چھپانا الگ بات ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش بھی نہ کی جائے، اور جو ہو رہا ہے اس کو ہونے دیا جائے، حدیث میں صاف آتا ہے: "من رأى منكم منكرا فلغيره بيده فإن لم يستطع فبلسانه فإن لم يستطع فبقلبه و ذلك أضعف الإيمان." (۲) (تم میں جو منکر دیکھے اپنے ہاتھ سے روک دے، اگر یہ بس میں نہ ہو تو زبان سے روکنے کی کوشش کرے، یہ بھی نہ کرسکتا ہو تو دل سے اس کو برا سمجھے، اس کے بعد ایمان کا کوئی درجہ نہیں)۔

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوتا ہے: "ما من رجل يكون في قوم يعمل فيهم بالمعاصي يقدرون على أن يغيروا عليه فلا يغيروا إلا أصابهم الله بعذاب من قبل أن يموتوا." (۱) (ایک شخص بھی اگر کسی قوم میں رہ کر معصیتیں کرتا ہے اور لوگ اس کو روکنے کی قدرت رکھنے کے باوجود نہیں روکتے تو وہ سب مرنے سے پہلے عذاب میں مبتلا ہوں گے)۔

بخاری شریف کی ایک حدیث میں اس کی بہت واضح مثال پیش کی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"حدود الٰہیہ میں داخل ہو جانے والے اس کو پامال کرنے والے اور اس میں مداہنت کرنے والے کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کچھ لوگوں نے کشتی پر سوار ہونے کے لیے قرعہ ڈالا، کچھ لوگوں کا نام بالائی منزل کے لیے نکلا اور کچھ لوگوں کا نیچے کے لیے، نیچے والے پانی لینے کے لیے اوپر جاتے تو اوپر والوں کو تکلیف ہوتی، نیچے والوں نے اس کو محسوس کیا تو کلہاڑی لی اور کشتی میں سوراخ کرنے لگے، اوپر والوں نے آکر پوچھا کہ یہ کیا کر رہے ہوں تو انھوں نے جواب دیا کہ اوپر آنے جانے میں تم لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے اور پانی ہمارے لیے ضروری ہے، اب اگر اوپر والوں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور سوراخ کرنے سے روکا تب تو وہ اپنے لیے بھی نجات کا سامان کریں گے اور ان کو بھی بچالیں گے، ورنہ خود بھی ہلاک ہوں گے اور ان کو بھی ہلاک کریں گے۔" (۱)

برائیوں سے روکنا ایک مذہبی فریضہ ہے، یہ مسلمانوں کے فرض منصبی میں داخل ہے، لیکن کسی کی برائیوں کو اچھالنا اور اس کو بے عزت کرنا سخت گناہ کی بات ہے، یہ حکم

شرعی ہے کہ برائیوں کو چھپایا جائے، ان کا چرچا نہ کیا جائے، اس کا بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اچھے لوگوں میں اس کا تذکرہ ہونے لگتا ہے اور ان میں بھی یہ برائیاں گھسنے لگتی ہیں۔

غیبت

تیسری بیماری جس کا آیت شریفہ میں ذکر ہے وہ غیبت ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضاً﴾

''اور نہ ایک دوسرے کی غیبت کرو۔''

غیبت کہتے ہیں پیٹھ پیچھے کسی کی برائی بیان کرنا، حدیث میں اس کی وضاحت وتفسیر موجود ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کرام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "أتدرون ما الغيبة؟ قالوا: الله ورسوله أعلم. قال: ذكرك أخاك بما يكره. قيل: أفرأيت إن كان في أخي ما أقول؟ قال: إن كان فيه ما تقول فقد اغتبته وإن لم يكن فيه فقد بهته"(۲) (تم جانتے ہو کہ غیبت کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بھائی کا ایسا تذکرہ جو اس کو ناپسند ہو۔ دریافت کیا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ (ناپسندیدہ) چیز موجود ہو جو میں کہہ رہا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اس کے اندر وہ چیز موجود ہے تب ہی تو تم نے غیبت کی اور اگر وہ چیز موجود ہی نہیں ہے تو تم نے اس پر تہمت لگائی (جو غیبت سے بڑا گناہ ہے)۔

عام طور پر لوگ اس غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں کہ اگر کسی ایسی برائی کو بیان کیا جائے جو موجود ہے تو یہ غیبت نہیں ہے، اس حدیث میں بات صاف کردی گئی کہ غیبت تو جب ہی ہے کہ برائی موجود ہو، اور اگر برائی موجود نہیں ہے تب تو یہ بہتان طرازی اور الزام تراشی ہے جو بدترین گناہوں میں سے ہے۔

غیبت کے اسباب

عام طور پر سوءِ مزاج کے نتیجہ میں آدمی غیبت میں مبتلا ہوتا ہے، بعض لوگ تو صرف ناعاقبت اندیشی کی بنا پر یہ کام کرتے ہیں، ان کو یہ خیال ہی نہیں رہتا کہ دنیا وآخرت میں اس کے نقصانات کیا ہیں، ایک بڑی تعداد انانیت پسند لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو کسی کو اٹھتا ہوا نہیں دیکھ سکتے، ان کے سامنے اگر کسی کی تعریف کی جانے لگے تو فوراً وہ برائیاں تلاش کر کے بیان کرنے لگتے ہیں، جب کہ اسلامی مزاج کا تقاضا یہ تھا کہ دس برائیوں میں اگر ایک نیکی بھی ہے تو نیکی کا چرچا کیا جائے اور برائیوں کا تذکرہ نہ ہو، تاہم یہ بھی خیال رہے کہ اگر کہیں گواہی دینے کا مسئلہ ہے یا کوئی کسی کے بارے میں مشورہ کر رہا ہے تو اپنے علم کے مطابق صحیح رائے کا اظہار ضروری ہے، ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے لیے دو لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری وضاحت فرمادی اور جو نقص تھا وہ بھی بیان کردیا تاکہ آدمی دھوکہ میں نہ پڑے اور بعد میں اس کو پچھتاوا نہ اٹھانا پڑے، محدثین کے یہاں جرح وتعدیل کا مستقل فن اسی لیے وجود میں آیا کہ غلط لوگوں سے روایات نقل کرنے میں احتیاط برتی جائے اور بے اصل روایات معاشرہ میں پھیل نہ جائیں، یہ ایک دینی شرعی مصلحت وضرورت تھی اور اب بھی اگر ضرورت پڑے تو بالکل دوٹوک انداز میں بات صاف کردی جائے تاکہ نہ افراد دھوکے میں پڑیں اور نہ ہی امت کسی دھوکہ کا شکار ہو، لیکن یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اس میں حدود قائم رکھے جائیں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس میں انانیت شامل ہوجاتی ہے اور اس پر ضرورت کا پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔

اس گناہ کی شدت

موجودہ دور میں یہ بیماری اچھے اچھے دیندار حلقوں میں پیدا ہوگئی ہے، جب

کہ حدیث میں اس کو بدترین گناہوں میں شمار کیا گیا ہے، بیہقی کی ایک روایت میں آتا ہے: ”الغیبة أشد من الزنا. قالوا یا رسول اللّٰہ! و کیف الغیبة أشد من الزنا؟ قال إن الرجل لیزنی فیتوب فیتوب اللّٰہ علیه، وإن صاحب الغیبة لا یغفر له حتیٰ یغفرها له صاحبه.“ (۱) (غیبت زنا سے زیادہ سخت ہے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! غیبت زنا سے زیادہ سخت کیسے ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی زنا کرتا ہے پھر وہ توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیتے ہیں اور غیبت کرنے والے کی اس وقت تک مغفرت نہیں ہوتی جب تک وہ شخص معاف نہ کردے جس کی اس نے غیبت کی ہے)۔

ظاہر ہے جس کی غیبت کی گئی ہے معاشرہ میں اس کو گرانے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ اس کا ایک بہت بڑا نقصان ہے، اسی لیے غیبت کو بھائی کے مردار گوشت کھانے کے مرادف قرار دیا گیا ہے، جب تک اس سے معافی نہ مانگ لی جائے، اس وقت تک اس گناہ سے معافی مشکل ہے اس لیے کہ یہ بندوں کے حقوق میں سے ہے، اللہ تعالیٰ اپنے حقوق تو معاف فرمادیں گے لیکن بندوں کے حقوق اس وقت تک معاف نہیں فرمائیں گے جب تک وہ ادا نہ کردیئے جائیں یا معاف نہ کرالیے جائیں۔

اگر معافی نہ مانگی جاسکے

کبھی ایسی صورت حال بھی پیش آتی ہے کہ جس کی غیبت کی گئی اس کا انتقال ہوگیا یا اس کا خطرہ ہے کہ اگر معافی مانگنے کے لیے غیبت کا تذکرہ بھی ہوا تو فریق ثانی کی طرف سے سخت ردعمل ہوگا اور اس کے نتیجہ میں حالات مزید بگڑ جائیں گے اور فتنہ پیدا ہوگا ایک حدیث میں ایسی صورت حال کا علاج بتایا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: ”إن من کفارة الغیبة أن تستغفر لمن اغتبته تقول اللّٰھم اغفر لنا وله“ (۱) (غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ جس کی تم نے غیبت کی ہو اس کے لیے استغفار کرو اور کہو کہ

اے اللہ ہماری اور اس کی مغفرت فرمادے)۔

بظاہر یہ حدیث ان ہی حالات کے لیے مخصوص ہے کہ جب معافی نہ مانگی جاسکتی ہو یا اس سے فتنہ کا خدشہ ہو، اس لیے کہ بیہقی کی اس سے پہلی والی روایت میں یہ صراحت ہے کہ جب تک معافی نہ مانگ لی جائے اس وقت تک اس گناہ کا معاف ہونا مشکل ہے، اس لیے اس دوسری حدیث کو مخصوص حالات پر محمول کرنا ہی مناسب ہے۔

مجالس غیبت میں شرکت کا وبال

جس طرح غیبت کرنا سخت گناہ ہے غیبت کا سننا اور ایسی مجالس میں شریک ہونا بھی گناہ ہے، حدیث میں آتا ہے: "من اغتيب عنده أخوه المسلم فنصره نصره الله في الدنيا والآخرة، وإن لم ينصره أدركه الله في الدنيا والآخرة." (۲) (جس کسی کے پاس اس کے مسلمان بھائی کی غیبت کی گئی اور وہ اس کی مدد پر قادر ہے اس نے اپنے بھائی کی مدد کی تو اللہ تعالیٰ دنیا وآخرت میں اس کی مدد فرمائیں گے اور اگر قدرت کے باوجود اس نے مدد نہ کی تو اللہ تعالیٰ دنیا وآخرت میں اس کی پکڑ کریں گے)۔

حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کبھی ایسی مجلسوں میں شرکت ہو بھی جائے اور کسی کی غیبت کی جائے تو شریک ہونے والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ جس کی غیبت کی جارہی ہے اس کا دفاع کرے، یہ اس کے لیے بڑے اجر کی بات ہے کہ وہ اس کی عزت رکھ رہا ہے اور اس مجلس میں اس کو ذلیل ہونے سے بچا رہا ہے، اللہ تعالیٰ بھی دنیا وآخرت میں اس کی مدد فرمائیں گے اس کو عزت بخشیں گے اور وہ ذلت سے محفوظ رہے گا، اس کے برخلاف اگر وہ مجلس میں پوری طرح شریک رہا، غیبت سنتا رہا اور اس پر ذرا بھی ناپسندیدگی ظاہر نہ کی تو اس کے لیے وبال ہے، اس کا خطرہ ہے کہ وہ دنیا وآخرت کی ذلت اٹھائے۔

اسی آیت میں غیبت کی برائی مزید وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے، اوراس میں نفسیات کواپیل کی جارہی ہےارشادہوتا ہے:

﴿أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتاً فَكَرِهْتُمُوهُ﴾ (۱)

''کیاتم میں کسی کواچھا لگے گا کہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے، اس سے تو تم گھن کروگے ہی۔''

غیبت کا ایک علاج

عجیب بات یہ ہے کہ عام طور پرمجلسوں میں غیبت کا سلسلہ جب چلتا ہے تو کسی کو خیال بھی نہیں رہتا اوراس میں مزہ آنے لگتا ہے، آیت شریفہ میں اس کا ایک نفسیاتی علاج بھی کیا گیا ہے،غیبت کے موقع پراگر یہ تصور کرلیا جائے کہ جس کی غیبت کی جارہی ہے درحقیقت اس کا سڑا ہوا گوشت کھایا جارہا ہے تو اس تصور سے ہی طبیعت اِبا کرنے لگے گی اور طبیعت سے کراہت سی پیدا ہوجائے گی، ظاہری طور پر آدمی خواہ اس کومحسوس نہ کرسکے لیکن یہ ایک حقیقت ہے،اورآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعجاز ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مرتبہ اللہ کے حکم سے ایسی چیزیں محسوس بھی کرادیں، حدیث میں ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک مرتبہ دوعورتوں نے روزہ رکھا، روزہ ان دونوں کواتنا لگا کہ وہ ہلاکت کے قریب پہنچ گئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوعلم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پیالہ ان کے پاس بھیجا اوران دونوں کواس میں قے کرنے کا حکم فرمایا، دونوں نے قے کی تو اس میں گوشت کے ٹکڑے اورتازہ کھایا ہوا خون نکلا، لوگوں کوحیرت ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی حلال روزی سے تو روزہ رکھا اورحرام چیزوں کوکھایا کہ دونوں عورتیں لوگوں کی غیبت کرتی رہیں۔(۱)

اس حدیث سے ایک بات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ غیبت کرنے والے کے

لیے نیکیاں مشکل ہو جاتی ہیں، اور اس کا ذہن غلط کاموں اور غلط باتوں کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے۔

غیبت سے روکنے والے کا اجر

جس طرح حدیث میں غیبت کرنے والے کو مردار بھائی کا گوشت کھانے والا کہا گیا ہے، اسی طرح اگر کوئی غیبت کرنے والے کو اس کے اس برے عمل سے باز رکھتا ہے تو وہ اپنے بھائی کی حفاظت کرنے والا شمار ہوگا، حدیث میں آتا ہے:

"من ذب عن لحم أخيه بالغيبة كان حقاً على الله أن يعتقه من النار"(۲) (غیبت کی وجہ سے اگر کسی کا گوشت محفوظ نہیں رہا اور کوئی اس کی حفاظت (غیبت کرنے والے کو غیبت سے روک کر) کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کو جہنم سے خلاصی عطا فرمائیں گے)۔

اللہ کی طرف سے یہ بدلہ اس کو اس کے عمل کے مطابق مل رہا ہے، وہ دوسرے کے گوشت پوست اور اس کے جسم کی حفاظت کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے جسم کی جہنم سے حفاظت فرمائیں گے۔

خیر کی کنجی

یہ تین وہ باطنی امراض ہیں جو اندر ہی اندر پنپتے رہتے ہیں اور کینسر کی طرح ایمان والے کی ہلاکت کا ذریعہ بن جاتے ہیں، بدگمانی اس کا سب سے پہلا زینہ ہے اس کے نتیجہ میں تجسس اور غیبت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، اور یہ سب چیزیں بے احتیاطی کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں اسی لیے اخیر میں تقوی کی تاکید کی جا رہی ہے ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾

"اور اللہ سے ڈرو۔"

یہ ہر خیر کی کنجی ہے، جس کے اندر تقویٰ کا مزاج بن گیا وہ دین کے سانچے میں ڈھل گیا، اس کے لیے نیک اعمال کا کرنا بھی آسان اور برائیوں سے بچنا بھی آسان، اور تقویٰ پیدا ہوتا ہے نیک صحبت سے اسی لیے ایک جگہ ارشاد ربانی ہے:
﴿یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾ (۱) (اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو اور سچوں کی صحبت اٹھاؤ۔)

توبہ وسیلۂ رحمت

آیت کا اختتام اللہ کے بندوں کے لیے مسک الختام ہے، جو اب تک کوتاہیوں میں مبتلا رہے، یہ اندر کی بیماریاں ان کو گھن کی طرح چاٹتی رہیں، اب بھی ان کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، توبہ کرنے والوں پر اللہ کی خاص رحمت ہوتی ہے، جو بھی اپنے عمل پر شرمندہ ہو کر بارگاہ الٰہی میں ملتجی ہوگا، اللہ تعالیٰ اس کو رحمت کی نگاہ سے دیکھیں گے ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ.﴾
''بلاشبہ اللہ توبہ قبول فرماتا ہے، رحم فرماتا ہے۔''
ضرورت ہے اپنا جائزہ لینے کی اور درِ رحمت کی طرف پلٹنے کی۔

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہارے خاندان اور برادریاں بنادیں تا کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، بلاشبہ تم میں سے بڑا عزت دار وہ ہے جو تم میں سب سے بڑا پرہیزگار ہو، بے شک اللہ خوب جانتا، خوب خبر رکھتا ہے۔"

وحدتِ آدمیت

اونچ نیچ کی بنیادیں

اس دنیا میں انسان کو بسے ہوئے لاکھوں سال گزر چکے ہیں، لیکن انسان انسان میں آج جتنا بھید بھاؤ ہے، شاید ہی کبھی دنیا نے اپنے اوپر بسنے والوں میں اس کا مشاہدہ کیا ہو، کہیں رنگ ونسل کا فرق ہے، کہیں علاقائی زبان کی بنیادوں پر ایک دوسرے کا خون کیا جارہا ہے، مالدار غریبوں کا خون چوسنے میں مصروف ہیں، انسانی مساوات و ہمدردی کی چولیں ہل چکی ہیں، سگے رشتوں میں اجنبیت کی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں، ایک افراتفری بلکہ نفسانفسی کا عالم ہے، یہ نتیجہ ہے دنیا کے ان خودساختہ نظاموں کا جن کے تجربے سے آج یہ دنیا گزر رہی ہے۔

یورپین قوموں کا اگر جائزہ لیا جائے تو سفید چمڑی کے پیچھے کالے کرتوتوں کا ایک سلسلہ ہے، خاندانی بنیادوں پر ان کے یہاں جو تفریق ہے، پڑھے لکھے لوگوں میں شاید ہی اس کی مثال ملے، کالے گورے کا امتیاز ان کی گھٹی میں پڑا ہے، کالوں کا درجہ ان کے یہاں جانوروں سے زیادہ نہیں تھا، اور اب بھی اس کی بُو ان کے مزاج میں بسی ہوئی ہے، لسانی تعصب کا حال یہ ہے کہ فرانس کے باشندہ کو جرمن زبان سے بیر ہے، تو جرمن کا رہنے والا جاننے کے باوجود فرانسیسی زبان بولنے کا روادار نہیں، انگریزی زبان جس کو مشرقی ملکوں کے سر تھوپ دیا گیا ہے، آج بھی بہت سے مغربی ممالک اس کا استعمال باعثِ عار سمجھتے ہیں، قبائلی عصبیت کی بنیادیں ان کے یہاں بہت گہری ہیں، البتہ موجودہ مغربی نظام نے آزادی کے پردہ میں بے حیائی کو اس قدر فروغ دے دیا ہے کہ باپ بیٹے کے مقدس رشتے میں گہری دراڑیں پڑ گئی ہیں۔

ہمارا ملک ہندوستان تو چھوا چھوت کا مرکز ہی ہے، یہاں انسان کو خاندانی بنیادوں پر جس طرح اونچ نیچ کا شکار بنایا گیا ہے، اس کی مثال دوسری جگہ ملنی مشکل ہے، یہ ہندوؤں کا مستقل ایک ''مذہبی فلسفہ'' ہے، جس کی انتہاء یہ ہے کہ اگر شودر کے کان میں ان کی مقدس کتاب کے اشلوک پڑ جائیں تو اس کے کانوں میں سیسہ پلا دینے کا مذہبی حکم ہے، خاندانی بنیادوں پر مذہبی مقامات کی تقسیم ہے، نچلی ذات کا آدمی اعلیٰ ذات کے مذہبی مقام پر نہیں جاسکتا، نہ ان کے ساتھ مذہبی رسوم میں شریک ہوسکتا ہے، ان کا تصور یہ ہے کہ اس ذات کے آدمی کو اعلیٰ ذات والوں کی خدمت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اعلیٰ ذات والوں سے برابری کا وہ خیال بھی نہیں لاسکتا۔

لسانی عصبیت کا عالم یہ ہے کہ ہندی جو سرکاری زبان ہے، جنوبی ہندوستان کی ریاستوں میں اس کا ملنا مشکل ہے، وہاں کے رہنے والوں سے اگر ہندی میں کوئی ضرورت مند سوال بھی کرے تو واقفیت کے باوجود وہ انجان بن جائیں گے، اور اب تو صوبائی عصبیت کو بھی فروغ دیا جا رہا ہے۔

دنیا کے دوسرے خطوں میں بھی کچھ اس انداز کی عصبیتیں نظر آئیں گی، رنگ ونسل، زبان، قومیت ووطنیت، خدا جانے کتنے بت ہیں جو دنیا کے انسانوں نے اپنے دلوں پر بٹھا رکھے ہیں، کچھ یہی صورت حال آج سے چودہ سو سال پہلے جزیرۃ العرب کی بھی تھی، انسانوں کی تقسیم قبائلی بنیادوں پر تھی، اسی کو تقابل وتفاخر کا معیار سمجھا جاتا تھا، زمانۂ جاہلیت کی عربی شاعری اس سے بھری پڑی ہے، ''أنصر أخاك ظالما أو مظلوما'' (۱) زمانۂ جاہلیت کا نعرہ تھا کہ اپنے بھائی کی مدد کرنی ہے، وہ حق پر ہو یا حق پر نہ ہو، ظلم کوئی کرتا تھا، پکڑا کوئی جاتا تھا، اسلامی مساوات نے آکر یہ سارے امتیازات مٹا دیئے اور صاف صاف اعلان کردیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا

وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا﴾ (۱)

''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تم کو برادریوں اور قبیلوں میں اس لیے بانٹا تاکہ تم ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرو۔''

یہ سورۂ حجرات کی تیرھویں آیت ہے، جس میں انسان کی اصل بیان کی گئی ہے، اور یہ بات صاف کردی گئی ہے کہ سب کے سب انسان ایک باپ اور ایک ماں کی اولاد ہیں، گویا کہ یہ ایک ایسی انسانی برادری ہے جس سے انسانی اخوت کا رشتہ قائم ہے، ایک بھائی کو دوسرے بھائی پر کسی قسم کا خاندانی امتیاز حاصل نہیں ہوتا، جو کچھ بھی امتیاز ہوتا ہے وہ فضل وکمال کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اسی آیت میں خاندانوں اور قبیلوں کی تقسیم کے بارے میں بھی صاف صاف کہہ دیا گیا کہ اس کی مصلحت صرف یہ ہے کہ اتنی بڑی انسانی آبادی میں ایک دوسرے کو پہچاننا اور معاملہ کرنا آسان ہو، خاندانی بنیادوں پر کسی کو کوئی تفوق وامتیاز حاصل نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے پہلے جو لشکر تیار فرمایا، حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو اس کا امیر بنایا، جبکہ حضرت عمرؓ جیسے حضرات اس لشکر میں موجود تھے (۲)، تاکہ اسلامی مزاج کی مکمل شرح و ترجمانی ہوجائے۔ اسی طرح فتح مکہ کے موقع پر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں داخل ہورہے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سواری پر قریشی بچوں کے بجائے ان بچوں کو بٹھایا جو خاندانی اعتبار سے وہ حیثیت نہیں رکھتے تھے (۳)، اس کی مصلحت یہی تھی، تاکہ عربوں کے ذہن سے نسلی تفاخر کا بیج نکل جائے، حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو خطاب کرکے فرمایا تھا: ''إن اللہ قد أذھب عنکم عبیۃ الجاھلیۃ و فخرھا بالآباء، مؤمن تقی وفاجر شقی، أنتم بنو آدم وآدم من تراب.'' (۱) (اللہ تعالیٰ نے جاہلی نخوت اور باپ دادا پر فخر وغرور کو تم سے دور کردیا، اب یا تو پرہیزگار مومن ہے یا بدبخت فاسق وفاجر، تم سب آدم کی اولاد ہو،

اور آدم مٹی سے بنے تھے)۔

اولادِ آدم کو بار بار یہ بتانے کی ضرورت اس لیے پڑ رہی ہے کہ اس نے اسی حقیقت کو فراموش کر دیا کہ وہ سب ایک باپ کی اولاد ہیں، ان سب کی اصل ایک ہی ہے، وہ اس بنیاد پر کس طرح اظہارِ فخر کر سکتے ہیں، جبکہ آدم کو مٹی سے بنایا گیا، بلال حبشیؓ، زید بن حارثہؓ، صہیب رومیؓ، سلمان فارسیؓ، سب اسی وحدت انسانی کی یادگار ہیں، جو انسانیت کے لیے اسلام کا بہت بڑا عطیہ ہے، اسلام نے ان غلاموں اور دور افتادہ کم حیثیت لوگوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کس طرح آغوشِ محبت میں لیا کہ قریش کے بڑے بڑے سرداروں کے لیے یہ حضرات باعثِ فخر بن گئے، حضرت عمر فاروقؓ ایک حبشی غلام کو سیدنا بلال کہہ کر کیوں خطاب کہہ رہے ہیں، یہ صرف اسلام کا تحفہ ہے، اس نے عزت کے پیمانے بدل دیئے، جو کمزور سمجھے جاتے تھے وہ سردار قرار پائے، جو عزت و ناموری میں ممتاز تھے، ان میں کتنوں کے نام و نشان مٹ گئے۔

جاہلیت نئے قالب میں

اس نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں میں آج دوبارہ وہ جاہلیت لوٹ کر آ رہی ہے، جو اہل دین سمجھے جاتے ہیں ان کے یہاں یہ بات پیدا ہو رہی ہے، مسجدوں اور مدرسوں کے نام برادریوں کے نام پر رکھے جانے لگے ہیں، یقیناً یہ اسی نخوت جاہلیت کا ایک بیج ہے، جو دماغوں میں پڑ گیا ہے، اس کو کھرچ کر پھینک دینے کی ضرورت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا: "من تعزی بعزاء الجاهلية فأعضوه بهن أبيه و لا تكنوا" (۱) (جو جاہلیت کا نعرہ لگائے، اس کو اس کے باپ کی کھلی گالی دو اور اشارہ کنایہ سے کام نہ لو)۔

یہ الفاظ اس زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں جو سراپا رحمت تھی، آپ صلی

اللہ علیہ وسلم اعمال جاہلیت کو مٹانے کے لیے تشریف لائے تھے، جاہلی نخوت کو کیسے برداشت فرماتے، ایک حدیث میں ارشاد ہوتا ہے: "ليس منا من دعا إلى عصبية." (۲) (جو عصبیت کی دعوت دے، اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں)۔

نشان امتیاز

اسلام نے تفاخر وتفاضل کے سارے حدود ختم کردیئے، صرف ایک حد باقی رکھی جو وجہ امتیاز ہے، اور نشان فخر ہے، اور وہ ہے تقویٰ اور پرہیز گاری کی حد۔

آیت شریفہ میں ایک بات اور خاص طور پر توجہ کرنے کی ہے، سورۂ شریفہ کی ابتداء سے بار بار اہل ایمان کو خطاب ہو رہا تھا، لیکن یہاں عمومی خطاب ہے، تمام انسانوں کے لیے، اس میں عالمی انسانی برادری کی طرف اشارہ ہے، تمام انسان خواہ کسی مذہب کے ماننے والے ہوں، کالے ہوں، گورے ہوں، امیر ہوں، غریب ہوں، محلات کے رہنے والے ہوں یا کاخ فقیری ان کا نشان امتیاز ہو، سب ایک باپ کی اولاد ہیں، اس حیثیت سے کسی کو کسی پر کوئی امتیاز حاصل نہیں، ارشاد نبویؐ ہے: "فليس لعربي على عجمي فضل ولا لعجمي على عربي فضل ولا لأسود على أبيض ولا لأبيض على أسود فضل إلا بالتقوى." (۱) (کسی عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، گورے کو کالے پر، کالے کو گورے پر کوئی امتیاز وفضیلت نہیں، سوائے تقویٰ کے امتیاز کے)۔

اس میں خاص طور پر دعوت عمل ہے کہ کوئی محض خاندانی امتیاز کی بناء پر مطمئن ہوکر بیٹھ نہ رہے، اصل وجہ امتیاز خصائص وکمالات اور صفات ہیں، جن کے لیے مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے، یہی خصائص وکمالات انسان کو دوسروں پر ممتاز کرتے ہیں۔

قبیلوں کی تقسیم کا مقصد

خاندانوں اور قبیلوں میں انسانوں کی تقسیم کا مقصد ایک دوسرے سے تعارف ہے، ایک خاندان آپس میں متعارف ہوتا ہے پھر اس کے دوسرے خاندانوں سے رشتے قائم ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے ضروریات وابستہ ہوتی ہیں، اور خاندانوں میں یہ چیز مزید ربط وارتباط کا ذریعہ بنتی ہے، لیکن لوگوں نے بجائے اس کے کہ اس کو تعارف ومحبت کا ذریعہ بناتے، تفرقہ، انتشار اور بھید بھاؤ کا ذریعہ سمجھ لیا تھا، آیت میں مختلف خاندانوں کے وجود میں آنے کا جو مقصد بیان کیا گیا ہے اس کو پلٹ دیا گیا تھا، اور اس خاندانی تعصب کی بنا پر حسد، غیبت، بدگمانی، بہتان طرازی، چغلی اور خدا جانے کتنے امراض اندر پیدا ہو گئے تھے، مذکورہ آیت سے پہلے والی آیت میں ان ہی باطنی امراض کے دور کرنے کا تذکرہ تھا، اب اس آیت میں خاص طور پر اس جاہلی تعصب پر بندش لگائی جارہی ہے، جس کے نتیجہ میں خاص طور پر مذکورہ بالا امراض پیدا ہو رہے تھے۔

طبعی شرافت

گزشتہ آیات میں اہل ایمان کو یہ حکم تھا کہ وہ بھائی بھائی بن کر رہیں، اور جو چیز بھی اس شفاف رشتہ کو گندہ کرسکتی ہو، اس سے پوری طرح گریز کریں، اب یہاں یہ بات یاد دلائی جارہی ہے کہ سب سے پہلا مرحلہ اخوت انسانی کے رشتہ کا ہے، جس کو ایمانی اخوت کا رشتہ مستحکم کرتا ہے، عقیدہ وایمان کی وحدت سے اس میں زبردست قوت پیدا ہو جاتی ہے، اس کا حاصل یہی ہے کہ تمام انسان ایک ہی باپ کی اولاد ہیں، کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں، جو کچھ امتیاز ہے وہ ایمان کا اور ایمانی صفات وکمالات کا ہے، اب اگر کسی کے اندر خاندانی طور پر قبول کرنے کی صلاحیت زیادہ ہے تو ذاتی طور

پر وہ شرافت نفس رکھتا ہے، وہ خیر کو قبول کرنے میں ایک جاذبیت محسوس کرتا ہے، تو یہ حقیقت میں ماحول کا اثر ہے، جن خاندانوں میں تعلیم وتربیت کا اہتمام رہتا ہے، ان کے بچوں میں ابتداء ہی سے اس کا رنگ نظر آنے لگتا ہے، اور کبھی شخصی اور ذاتی طور پر بعض لوگوں میں طبعی شرافت ہوتی ہے، اسی کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے: "الناس معادن کمعادن الفضة والذهب، خيارهم في الجاهلية خيارهم في الإسلام إذا فقهوا." (۱) (لوگ کانوں کی طرح ہیں، جیسے سونے چاندی کی کانیں ہوتی ہیں، جو جاہلیت میں بہتر ہیں وہ اسلام میں بھی بہتر ہیں، اگر وہ دین کی سمجھ پیدا کر لیں)۔

کبھی کبھی خاص ماحول کی نتیجہ میں خاندانوں میں یہ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے، عام طور پر یہ چیز تعلیم وتربیت سے پیدا ہوتی ہے، اور گہری ہوتی جاتی ہے، طبعی طور پر ان لوگوں کے لیے خیر کی صفات کا حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہے، اور کم محنت سے بعض مرتبہ ان کو بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے، لیکن وجہ امتیاز صفات ہی ہیں، جو ان صفات ایمانیہ کو جتنا اپنے اندر پیدا کرے گا اتنا ہی وہ حقیقی عزت کا مالک ہوگا، اسی لیے صاف صاف یہ اصول بتا دیا گیا:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾

"اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بڑھ کر عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔"

أتقیٰ، تقویٰ سے اسم تفضیل بنایا گیا ہے، یعنی سب سے زیادہ تقویٰ والے، یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ تقویٰ کی حقیقت کیا ہے، وہ کیسے اور کب حاصل ہوتا ہے؟ عام طور پر لوگ اس کو متقی سمجھتے ہیں جس کی ظاہری وضع قطع متقیوں کی سی ہو، لیکن یہ تنہا کافی نہیں، اس میں ظاہر وباطن دونوں کی شفافیت مطلوب ہے، وہ کب

حاصل ہوگی، اور اس کے لیے کیا شرائط واصول ہیں، اس کی وضاحت کے لیے آیات قرآنیہ کا سہارا لیناضروری ہے۔

تقویٰ درحقیقت دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو انسان کے اندر خشیت الٰہی پیدا کرے، اور اس کو خیر پر قائم رکھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے ایک بار تین مرتبہ سینہ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ”التقوىٰ ھٰھنا“ (۱) (تقویٰ کی جگہ یہ ہے)۔

صدق تقویٰ کا زینہ

قرآن مجید میں صفتِ صدق کو تقویٰ کی سیڑھی کہا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (۲) (جو سچائی کے ساتھ آیا اور اس کو سچ مانا، وہی لوگ تقویٰ والے ہیں)۔

یہ صدق صرف زبان کی سچائی نہیں ہے، بلکہ اندر باہر کا توافق ہے، حقیقت شناسی اور حق رسی ہے جس کی روشنی انسان کے ظاہر و باطن کو یکساں روشن کر دیتی ہے، یہ سچائی جس کو مل جاتی ہے، اس کے دل کے داغ دھبے مٹ جاتے ہیں، اور وہ تقویٰ سے آراستہ ہو جاتا ہے، قرآن مجید میں دوسری جگہ تفصیل سے اہل تقویٰ کا بیان ہے:

﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ.﴾ (۱) (لیکن نیکی یہ ہے جو اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، اور کتاب پر، اور نبیوں پر ایمان لایا، اور چاہت کے باوجود رشتہ داروں پر، یتیموں پر اور مسکینوں پر، مسافروں پر اور سوال کرنے والوں پر اور غلام آزاد کرنے میں مال خرچ

کیا، اور نماز قائم کی، اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی، اور جو وعدہ کرکے اپنے وعدے کو پورا کرنے والے ہیں، اور سختی اور تکلیف اور لڑائی میں صبر کرنے والے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو سچے ٹھہرے اور تقویٰ والے ہیں)۔

اس آیت میں بھی صفات قبولیت کے بیان کے بعد پہلے "أُولَـئِكَ الَّـذِيْـنَ صَـدَقُوْا" (یہی لوگ سچے ٹھہرے) کہہ کر یہ حقیقت واضح کردی گئی کہ صدق، تقویٰ کی سیڑھی ہے۔

شعائر اللہ کی عظمت

بہت سے ذہنوں میں یہ بات گردش کرتی رہتی ہے کہ تقویٰ ایک سلبی صفت ہے، اس کے اصل مفہوم میں بچنا اور پرہیز کرنا داخل ہے، جبکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کا اصل پہلو ایجابی ہے، ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت پیدا ہوتی ہے، امور خیر کی دلوں میں تحریک پیدا ہوتی ہے اور ہر برے کام سے نفرت کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے، دلوں میں شعائر اللہ کی عظمت بیٹھ جاتی ہے، اور اللہ کا نام آتے ہی دل جھک جاتے ہیں: ﴿وَمَـنْ يُّـعَـظِّـمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَىٰ الْقُلُوْبَ﴾ (۱) (اور جو شعائر الٰہی کی تعظیم کرتا ہے، تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے)۔

سورۂ شریفہ کے آغاز ہی میں یہ حقیقت بھی بیان ہوچکی ہے کہ عظمت رسالت تقویٰ کا معیار ہے: ﴿إِنَّ الَّـذِيْـنَ يَـغُـضُّـوْنَ أَصْـوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰـهِ أُوْلـئِكَ الَّـذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ﴾ (۲) (بلاشبہ جو لوگ اللہ کے رسول کے سامنے اپنی آوازوں کو پست کرتے ہیں، ان ہی کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے)۔

اپنی چاہت اور مزاج کے خلاف منشائے نبویؐ کے آگے جھک جانے کو بھی

تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے، صلح حدیبیہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بظاہر دَب کر جو معاہدہ فرمایا، اس سے صحابہؓ پر طبعی اثر پڑا، جمعیت بھی تھی، بہادری کے جوہر دکھانے کا وقت معلوم ہورہا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح فرمالی، اور صحابہؓ نے سرِ تسلیم خم کردیئے، اسی کو اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے:﴿وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ﴾ (اور ان کو تقویٰ کی بات پر لگادیا)۔

آگے ان کی فضیلت بیان فرمائی:﴿وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا﴾ (۳) (اور وہ اس کے زیادہ حقدار اور اہل تھے)۔

نتیجہ اہل ایمان کے حق میں نکلا، صلح کی مختصر مدت میں اتنی بڑی تعداد میں لوگ دین میں داخل ہوئے جو کبھی نہیں ہوئے تھے، وجہ یہ تھی کہ ان کو دین سمجھنے کا موقع مل گیا۔

ایفائے عہد اور درگذر

ایک دوسری آیت میں دشمنوں کے ساتھ ایفائے عہد اور حتی الامکان جنگ سے پرہیز کرنے والوں کو متقی فرمایا گیا ہے:﴿فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾ (۱) (تو تم ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک پورا کرو، بیشک خدا تقویٰ والوں کو پسند فرماتا ہے)۔

دوسروں کی خاطر اپنا حق چھوڑ دینے، درگزر کردینے کو بھی تقویٰ سے قریب تر بتایا گیا ہے:﴿وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَإِنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾ (۲) (اور اگر تم ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دو، جبکہ تم ان کے لیے مہر متعین کرچکے ہو، تو تمہارے متعین کردہ مہر کا آدھا لازم ہوا، الا یہ کہ عورتیں معاف کردیں، یا وہ معاف کردے جس کے ہاتھ میں نکاح کا معاملہ ہے، اور اگر تم معاف کرو تو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے، (یعنی بجائے آدھا دینے کے پورا

دے دو اور نصف کی جو معافی تمہیں مل رہی ہے، اس سے فائدہ نہ اٹھاؤ)۔

اہل تقویٰ کی صفات

اہل تقویٰ کی صفات کا بیان قدرے تفصیل سے سورۂ آل عمران میں موجود ہے:

﴿وَسَارِعُوْٓا إِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ، الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعٰفِيْنَ عَنِ النَّاسِ، وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ، وَالَّذِيْنَ إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوْٓا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ، وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ.﴾ (۱) (اور اپنے رب کی بخشش کی طرف اور ایسی جنت کی طرف لپکو، جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، جو پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے، جو خوشحالی اور تنگی میں خرچ کرتے رہتے ہیں، اور جو غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگذر کرنے والے ہیں، اور اللہ بہتر کام کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے، اور وہ لوگ جو کھلی برائی کر جاتے ہیں، یا اپنی جانوں کے ساتھ ناانصافی کر گزرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں، سو اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں، اور کون ہے جو اللہ کے سوا گناہوں کو معاف کرے، اور اپنے کیے پر وہ اصرار نہیں کرتے جبکہ وہ خوب جانتے ہیں)۔

صبر

دشمنوں کی ایذاء رسانی پر صبر کرنے والوں کو بھی اہل تقویٰ شمار کیا گیا ہے:

﴿لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ أَشْرَكُوْٓا أَذًى كَثِيْراً وَّإِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَإِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الأُمُوْرِ.﴾ (۲) (تمہیں ضرور اپنے مالوں اور جانوں میں آزمایا جائے گا، اور جن

لوگوں کو تم سے پہلے کتاب ملی ان سے اور مشرکوں سے تم ضرور بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے اور اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو یہ بڑی ہمت کے کام ہیں)۔

خیر کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرنے اور برائیوں میں اس سے بچنے کا تذکرہ تقویٰ ہی کے ساتھ کیا گیا ہے: ﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ (۳) (نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرتے رہو اور گناہ اور ظلم کی باتوں پر ایک دوسرے کی مدد مت کرنا اور اللہ سے ڈرتے رہو، بلاشبہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے)۔

نیکیوں کی بنیاد

حاصل یہ ہے کہ تقویٰ تمام نیکیوں کی بنیاد اور اصل الاصول ہے، بقول علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کہ "اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو ہم اس کو "تقویٰ" سے ادا کر سکتے ہیں۔"(۱)

تقویٰ اصلاً تو دل کی ایجابی کیفیت کا نام ہے لیکن اس کے نتائج ایجابی بھی ہیں اور سلبی بھی، ہر خیر کی طرف بڑھنا اور ہر شر سے بچنا، دونوں باتیں تقویٰ کے لوازمات میں سے ہیں، کوئی شخص نماز، روزہ کرتا ہے، لیکن کسی کا دل دکھاتا ہو، کسی کو تکلیف پہنچاتا ہو، حق تلفی کرتا ہو، بدنگاہی میں مبتلا ہو جاتا ہو، معاملات میں پختگی نہ رکھتا ہو، جھوٹ بولتا ہو، وعدہ پورا نہ کرتا ہو، اور دوسرے گناہوں میں بھی مبتلا ہو جاتا ہو، تو وہ ہرگز متقی کہلانے کا مستحق نہیں ہے، احتیاط کی زندگی گزارنا، اللہ کا ہمہ وقت دھیان رہنا، ہر عمل میں اس کا لحاظ رکھنا کہ وہ کہیں اللہ کو ناراض کرنے والا عمل نہ ہو، یہ تقویٰ ہے، اسی لیے ایک صحابیؓ نے تقویٰ کی تعریف کرتے ہوئے ایک بہترین مثال دی، انھوں نے دوسرے صحابیؓ کو جنھوں نے تقویٰ کے بارے میں سوال کیا تھا، خطاب کر کے کہا کہ کیا تمہارا گزر کبھی خاردار راستہ سے ہوا ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ کہا کس طرح

گزرے؟ انھوں نے جواب دیا کہ کپڑے سمیٹ کر گزرا کہ کہیں دامن کانٹوں میں الجھ نہ جائے۔فرمایا: اسی کا نام تقویٰ ہے۔‘‘

حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے راستہ کو خاردار کانٹوں سے گھیر دیا ہے(۲)، جو اس میں الجھا، وہ گیا، یہ کانٹے ہیں بے جا خواہشات کے، نفسانیت کے، خودغرضی کے، غرور و گھمنڈ کے، من چاہی کے، ان سے دامن بچا کر زندگی گذارنا تقویٰ ہے، اسی لیے اس کو ’’ملاك الأمر‘‘ یعنی دین کی اصل قرار دیا گیا ہے۔

عزت کا معیار

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے اس کو اصل معیار شرافت قرار دیا ہے، اور قرآن مجید نے اسی کو عزت کی کسوٹی بتایا ہے، علامہ سید سلیمان ندوی سیرۃ النبیؐ میں تقویٰ کے مضمون کو ان الفاظ پر ختم فرماتے ہیں:

’’اسلام میں تقویٰ کو جو اہمیت حاصل ہے، اس کا اثر یہ ہے کہ تعلیم محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے رنگ، وطن، خاندان، دولت، حسب نسب، غرض نوع انسانی کے ان صدہا خودساختہ اعزازی بتوں، مرتبوں کو مٹا کر صرف ایک ہی امتیازی معیار قائم کردیا، جس کا نام تقویٰ ہے، اور جو ساری نیکیوں کی جان ہے، اور اس لیے وہی معیار امتیاز بننے کے لائق ہے، چنانچہ قرآن پاک نے بآواز بلند یہ اعلان کیا: ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (تم میں خدا کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔)(۱)

آیت شریفہ کا اختتام اللہ تعالیٰ کی جن صفات پر ہو رہا ہے، اس سے یہ حقیقت واضح کی جارہی ہے کہ تقویٰ دل کے اندر کی ایک کیفیت ہے، ظاہر میں انسان کتنے ہی تقویٰ کا اظہار کرے مگر اللہ کے نزدیک وہی ظاہر معتبر ہے جو باطن کا ترجمان

ہو، اور وہ دل کی گہرائیوں سے واقف ہے، باریک سے باریک تر اور مخفی سے مخفی تر اشیاء اور حقائق کو وہ جانتا ہے، دنیا میں ایک انسان انسانوں کو دھوکہ دے سکتا ہے، مگر کوئی اپنے مالک کو دھوکہ نہیں دے سکتا، صاف صاف کہہ دیا گیا:

﴿إِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ﴾

''بلاشبہ اللہ خوب جاننے والا، پوری خبر رکھنے والا ہے۔''

﴿قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلٰكِنْ قُوْلُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَإِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ لَا يَلِتْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

''بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، کہہ دیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے البتہ تم یہ کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے، جبکہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں نہیں اترا، اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی پیروی کروگے تو وہ تمہارے کاموں میں کچھ بھی کم نہ کرے گا، بلاشبہ اللہ بہت بخشش کرنے والا، نہایت رحم فرمانے والا ہے۔''

اسلام اور ایمان

اسلام اور ایمان کا فرق

اسلام اور ایمان بڑی حد تک ایک ہی مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں، لیکن قرآن وحدیث کی اصطلاح میں ان کو کچھ فرق کے ساتھ بھی استعمال کیا گیا ہے، جس کی وضاحت اس حدیث سے ہوتی ہے جو امام مسلمؒ نے اپنی صحیح کے آغاز میں درج کی ہے، اس کو حدیث جبرئیل کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، یہ ۱۰ھ کا واقعہ ہے، حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے سوالات کیے کہ ان کے جوابات سے حضرات صحابہؓ کے سامنے ان کی زبان مبارک سے پورے دین کا خلاصہ ہوجائے، ان ہی سوالات میں ایک سوال اسلام کے بارے میں تھا، اور ایک ایمان کے بارے میں، اسلام کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا تھا: "أن تشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله وتقيم الصلوة وتؤتي الزكوة وتصوم رمضان وتحج البت إن استطعت إليه سبيلا." (تم زبان سے اس کا اقرار کرو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، تم نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو، اور استطاعت ہو تو حج بیت اللہ کرو)۔

ایمان کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ تھا: "أن تؤمن بالله وملائكته وكتبه ورسله واليوم الآخر والقدر خيره وشره." (تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر اور بھلی یا بری تقدیر پر)۔(۱)

ان دونوں ارشادات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلام کا تعلق ظاہر سے ہے اور ایمان کا تعلق باطن سے اور دین ان دونوں کے مجموعہ کا نام ہے، نہ ایمان کے بغیر اسلام کا تصور ممکن ہے، اور نہ ایمان اسلام کے بغیر مکمل ہوسکتا ہے، دونوں ایک دوسرے کے لیے ضروری ہیں، عقائد کی درستگی دین کی بنیاد پر ہے اور اعمال کے بغیر اس بنیاد پر تعمیر نہیں ہوسکتی، اسلام کی عمارت ان دونوں سے مل کر مکمل ہوتی ہے، اگر عقائد درست ہیں لیکن اعمال میں کوتاہی ہے تو یہ فسق ہے اور اگر عقائد ایمان کے مطابق نہیں ہیں اور اعمال اسلامی ہیں تو یہ نفاق ہے۔

اسلام لانے والوں کی قسمیں

زمانۂ نبوت میں جب اسلام کا بول بالا ہوا، اور ﴿یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ أَفۡوَاجاً﴾ (۲) کا سماں بندھ گیا تو کافروں کی ایک بڑی تعداد اسلام میں صرف اس لیے داخل ہوگئی تا کہ اس کو ہر طرح کے منافع حاصل ہوسکیں، اور اسلامی معاشرہ میں ان کو قدر و منزلت حاصل ہو، ان میں بڑی تعداد بعد میں مخلص مسلمان ہوگئی اور ایک تعداد ان لوگوں کی باقی رہی جو صرف ظاہری طور پر مسلمان تھے، اور ایک تعداد ان دشمنوں کی بھی تھی جنھوں نے اسلام کا لبادہ صرف اس لیے اوڑھا تھا تا کہ وہ مسلمان بن کر مسلمانوں میں انتشار پیدا کرسکیں، اور اس کے لیے ان کو اندر گھسنے کے مواقع آسانی سے حاصل ہوجائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا معاملہ فرماتے تھے، اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی ان کے بارے میں بخوبی علم ہو چکا تھا لیکن اعمال کی بنیاد پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا برتاؤ باقی رکھا تھا، پھر جب غزوۂ تبوک کے بعد ان منافقین کے سلسلہ میں بہت سخت آیات نازل ہوئیں تو ان منافقین کے بارے میں آپ کا رویہ تبدیل ہوگیا جن کا نفاق کھل گیا تھا، ان منافقین میں اکثریت یہودیوں کی تھی، جو محض بغض و عناد میں اپنے نفاق پر قائم تھے اور

ان کا مقصد ہی مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنا اور ان کو کمزور کرنا تھا، ورنہ اور منافقوں کا حال یہ تھا کہ چند کو چھوڑ کر تقریباً سب ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ اور اسلام کے نظام عادلانہ سے متأثر ہو کر سچے مسلمان بن چکے تھے۔

بدوؤں کا حال

غلبہ اسلام کے بعد اسلام لانے والوں کی ایک بڑی تعداد ان بدوؤں کی تھی جو مختلف علاقوں سے آ کر مسلمان ہوتے تھے اور ان ہی میں بعض صرف فائدہ اٹھانے کے لیے مسلمان ہوئے تھے، ان ہی لوگوں میں بنواسد کا وفد بھی تھا، جو ۹ھ میں آیا تھا، وہ زمانہ ان کے یہاں قحط سالی کا تھا، وہ خود ہی مسلمان ہو کر اس لیے آ گئے تھے تاکہ ان کو مصیبت میں کچھ راحت مل سکے، وہ آئے تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہا کہ ہم خود اپنے مال و اولاد کے ساتھ خدمت میں حاضر ہو گئے ہیں، ہم ان دوسرے قبائل کی طرح نہیں ہیں، جن سے آپ کو مقابلہ کرنا پڑا، بار بار وہ یہ احسان جتاتے تھے، اور چاہتے تھے کہ ان کو زیادہ سے زیادہ صدقات حاصل ہو جائیں، سورۂ حجرات کی یہ آخری آیات اسی موقع پر نازل ہوئیں (۱):

﴿قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلٰكِنْ قُوْلُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (۲)

''بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، کہہ دیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے البتہ تم یہ کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے، جبکہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں نہیں اترا۔''

أعراب، أعرابي کی جمع کے طور پر استعمال ہوتا ہے، عرب کے بدوؤں کے لیے یہ لفظ بولا جاتا تھا، عام طور پر ان میں ثقافت کی کمی ہوتی تھی، لیکن عربوں کی بہت سی خصوصیات کے وہ حامل ہوا کرتے تھے، خاص طور پر عربی زبان میں ان کو امتیاز

بہت بعد تک حاصل رہا، ان کے مزاج میں عام طور پر سختی ہوتی تھی، بنواسد بھی ان ہی اعراب میں شامل تھے، اور یہاں آیت میں خاص طور پر ان ہی کو خطاب کیا جا رہا ہے، تاکہ حقیقت ان کی سمجھ میں آجائے، اور ان کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے کہ زبان سے اسلام کا اقرار کافی ہے، اور اس سے ان کو وہ ساری سہولیات حاصل ہو جائیں گی جو مسلمانوں کو غلبہ اسلام کے وقت کسی درجہ حاصل ہوگئی تھیں، آگے ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَإِنْ تُطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا﴾ (۱)

"اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی پیروی کرو گے تو وہ تمہارے کاموں میں کچھ بھی کم نہ کرے گا۔"

قرآنی تلقین

یہ حکمت قرآنی ہے کہ ان کو غلطی پر متنبہ کرنے کے بعد صحیح راستہ کی تلقین بھی کی جا رہی ہے کہ اپنے وقت کو صرف حصول دنیا میں ضائع نہ کرو، جب تم مسلمان ہو رہے ہو تو صحبت نبوت کا فیض اٹھاؤ، اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح بتائیں اس طرح اپنے ایمان کی تجدید کرو اور اسلام کو مکمل کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارے اقرار کو ضائع نہیں فرمائے گا اور تم سچے پکے مسلمان بن جاؤ گے، پھر اسی کی تاکید کے طور پر ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ.﴾

"بلاشبہ اللہ بہت بخشش کرنے والا، نہایت رحم فرمانے والا ہے۔"

تمہاری غلطی معاف کر دی جائے گی لیکن اسی وقت جب تم خود اس کی فکر کرو اور اپنے حالات کو درست کرلو۔

دعوتِ فکر

یہ آیت شریفہ ہم سب مسلمانوں کے لیے دعوت فکر ہے، صرف زبان سے

اقرار کر لینا، اعمال کو اختیار کر لینا کافی نہیں ہے، جب تک ایمان دل میں اتر نہ جائے اس وقت تک خواہ نام کچھ بھی ہو لیکن وہ اللہ کے یہاں مقبول نہیں، ایک بڑے عارف نے یہ بات بڑی دل سوزی کے ساتھ کہی کہ آج مسلمانوں کے قبرستانوں میں نہ جانے کتنے وہ لوگ دفن ہو رہے ہیں جو اللہ کے یہاں مسلمان نہیں، صحیح مسلمان ہونے کے لیے ایمان شرط ہے، اور ایمان صحت عقائد کا نام ہے، اور عقائد میں پہلا مرحلہ عقیدہ توحید کا ہے اور اس کے بارے میں عام طور پر مسلمانوں کا ذہن صاف نہیں، ایک اللہ کے ساتھ نہ جانے کتنے معبودان باطل اپنے دل کے نہاں خانوں میں پالے جا رہے ہیں، اور بعض مرتبہ ان لوگوں کی زبان وقلم سے جو اہل حق کہلاتے ہیں، مسلمانوں کے نمائندے سمجھے جاتے ہیں، ایسے جملے نکل جاتے ہیں جو عقیدہ توحید کے چشمہ صافی کو گدلا کر کے چھوڑتے ہیں، کہنے والا شاید محسوس بھی نہیں کر پاتا لیکن بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے، اچھے اچھے لوگوں کی زبان سے یہ جملہ سنا گیا ہے کہ "اللہ اور اس کا رسول چاہے تو ایسا ہو جائے گا۔" یہ اللہ کی صفت قدرت میں شرک ہے، وہ جو چاہے کرے، "فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ"، صرف اسی کی صفت ہے۔

عقائد وایمانیات کو بہت کھنگالنے کی ضرورت ہے، ایمان کے منافی جو چیزیں بھی ہمارے معاشرے میں داخل ہوگئی ہیں ان کو کھرچ کھرچ کر پھینکنے کی ضرورت ہے، تاکہ ہم جس طرح مسلمان نظر آتے ہیں، حقیقی معنوں میں مسلمان بن جائیں، اور ایمان واسلام کو مکمل کر کے دین کے پوری طرح حامل وترجمان بن جائیں، ہماری زندگی حقیقت دین کی دعوت ہو، اور ہم سراپا عمل ہوں، ہمارا ایمان بھی خالص ہو اور ہمارا اسلام بھی مکمل ہو۔

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴾

''ایمان والے تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول پر یقین کیا پھر وہ شک میں نہیں پڑے اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے انھوں نے اللہ کے راستہ میں جہاد کیا، سچے لوگ تو وہی ہیں۔''

حقیقت ایمان

ایمان صرف اقرار کا نام نہیں

ایمان صرف زبان سے اس کے اقرار کا نام نہیں، حقیقت میں اس کا تعلق دل سے ہے، اگر کوئی اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہے اور کام کاج بھی مسلمانوں جیسے کرتا ہے، اس کو دنیا لاکھ مسلمان سمجھے لیکن اگر اس کا دل اللہ کے سامنے جھکا نہیں ہے اور شکوک وشبہات کے دائرہ سے وہ نہیں نکل سکا ہے تو اہل ایمان کی فہرست میں اس کا شامل ہونا بہت مشکل ہے، اس کا امتحان ہوتا ہے، مصائب ومشکلات کے وقتوں میں، اس وقت اگر آدمی ثابت قدم ہے اور اس کا دل پوری طرح مطمئن ہے تو وہ ایمان والا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُّتْرَكُوْا أَنْ يَّقُوْلُوْا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ، وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِيْنَ﴾ (کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے اس قول کے بعد کہ ہم ایمان لے آئے ان کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا اور ان کو آزمایا نہ جائے گا، جبکہ ہم نے ان سے پہلے والوں کو بھی آزمایا، تو اللہ سچوں کو بھی خوب پرکھ لے گا اور جھوٹوں کو بھی خوب پہچان لے گا)۔

سورۂ حجرات کی پندرہویں آیت میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أُولٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُوْنَ.﴾ (۱)

''ایمان والے تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول پر

یقین کیا پھر وہ شک میں نہیں پڑے اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں
سے انھوں نے اللہ کے راستہ میں جہاد کیا، سچے لوگ تو وہی ہیں۔''

یقین کی ضرورت

اوپر والی آیت میں گزر چکا ہے کہ بنو اسد کے بدو اپنے ایمان کے دعویٰ کے ساتھ آئے تھے، ان سے کہہ دیا تھا کہ ابھی تم ایمان والے نہیں ہو، مذکورہ آیت میں ایمان کی تشریح کی جارہی ہے، اور یہیں سے ان بدو قبائل کے سامنے یہ وضاحت بھی ہورہی ہے کہ اگر تم ایمان چاہتے ہو تو اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر پورا یقین ہو، اس میں شبہ نہ ہو، اور اس کی بڑی علامت یہ ہے کہ جان و مال کی قربانی دشوار نہ رہ جائے۔

یہ بات ہر ایک آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اگر کوئی بڑی منفعت پیش نظر ہو تو انسان کے لیے دشواریاں آسان ہوجاتی ہیں، فائدہ کا جتنا زیادہ یقین ہوجاتا ہے اس کے بقدر اس کی راہ کی مشکلات آسان ہوتی ہیں، یہی حال ایمان کا ہے، اللہ اور اس کے رسول پر ایمان جتنا زیادہ طاقتور ہوتا ہے، اس کے بہترین نتائج کا یقین بڑھتا جاتا ہے، پھر آدمی کا حال یہ ہوجاتا ہے کہ اس راہ میں اپنی جان کی بھی کوئی قیمت نہیں رہ جاتی ؎

جان کی قیمت دیار عشق میں ہے کوئے دوست
اس نوید جانفزا سے سر وبالِ دوش ہے

حقیقی ایمان کا نتیجہ

حضرات صحابہ کی قربانیوں کا راز یہی تھا، غزوۂ احد کے موقع پر ایک صحابی کھجوریں کھاتے کھاتے بے خود ہوکر کہنے لگے کہ یہ تو طویل عمر ہوئی، کھجوریں پھینکیں اور بڑھ کر جام شہادت نوش کیا، انھوں نے جنت کی خوشبو محسوس کرلی، اور حضرات کا

یقین مشاہدہ کے درجہ کو پہنچ رہا تھا، حضرت علی کرّم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ اگر جنت اور دوزخ میرے سامنے لے آئے جائیں تو میرے یقین میں اضافہ نہ ہو، اس یقین کا نتیجہ یہ تھا کہ انھوں نے دنیا کے حالات بدل دیے، وہ جہاں گئے وہاں کی دنیا بدل گئی، ایمان ویقین کی ہوائیں چلنے لگیں، وہ ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض یافتہ تھے، جو ان کی صحبت میں رہ گیا وہ کندن بن گیا، یہ حقیقت ایمان ہے۔

اللہ کی ذات پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدوں پر یقین جتنا بڑھتا جاتا ہے، دل کی بستی آباد ہوتی جاتی ہے، دل کی بسی ہوئی بستی کو دنیا کی کوئی طاقت ویران نہیں کر سکتی، آج مسلمانوں کی پستی کا راز یہی ہے کہ دلوں کی بستیاں ویران ہیں، اس میں جب تک ایمان ویقین کی شمعیں نہیں روشن کی جائیں گی، مسلمانوں کے لیے عزت و بلندی کا حصول سخت دشوار ہے، سربلندی کا وعدہ تو ایمان پر ہے، "وأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين"۔

موجودہ صورت حال

مسلمان کروڑوں نہیں ارب سے متجاوز ہیں، لیکن دنیا میں ان کی کوئی وقعت نہیں، اس کی وجہ ایمان ویقین کی کمی بلکہ عام طور پر اس کا فقدان ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ روپیوں کی خاطر ایمان بیچا جا رہا ہے، حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پیشین گوئی فرمائی تھی: "يصبح الرجل مؤمنا ويمسي كافرا ويمسي مؤمنا ويصبح كافرا يبيع دينه بعرض من الدنيا" (آدمی صبح مسلمان ہوگا اور شام کو کافر، شام کو مسلمان ہوگا صبح کو کافر، وہ اپنے دین کو دنیا کے چند ٹکوں کی خاطر بیچ دے گا)۔

آج یہ چیز حقیقت بن کر سامنے آرہی ہے۔

ایمان کی کسوٹی

ایمان جب تک اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر مضبوط نہ ہوگا، اور اسباب دنیا ہی میں آدمی پڑا رہے گا، اس وقت تک شکوک وشبہات کا ازالہ بہت مشکل ہے، اور اس کی کسوٹی یہی ہے کہ اللہ کے راستہ میں جان و مال کی قربانی کی جب بھی ضرورت پیش آئے وہ ہمہ وقت تیار رہے، "جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ" کا یہی مطلب ہے، ایمان مضبوط ہو اور قربانی دینا آسان ہو جائے تو یہ "صدق" کی علامت ہے اور ان ہی لوگوں کو "صادقین" کہا گیا ہے، صدق سچائی کو کہتے ہیں، یہاں صرف زبان کی سچائی کافی نہیں بلکہ قول وعمل دونوں کی سچائی مراد ہے، قول میں بھی سچائی ہو، عمل میں بھی سچائی ہو اور نیت میں بھی سچائی ہو، صادقین ان لوگوں کو یہاں اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ صرف زبان سے مسلمان نہیں ہوتے بلکہ ان کا دل بھی اس کی گواہی دیتا ہے اور وہ دل سے اس کو تسلیم کرتے ہیں، ان کی زبان دل کی صحیح ترجمان ہوتی ہے، وہ اس میں نہ کچھ ہیر پھیر رکھتے ہیں اور نہ ہیر پھیر کرتے ہیں۔

﴿ قُلْ أَتُعَلِّمُونَ اللّٰهَ بِدِينِكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ☆ يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا قُلْ لَّا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنتُمْ صَادِقِينَ ☆ إِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللّٰهُ بَصِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ☆﴾

''کہہ دیجیے کہ کیا تم اللہ کو اپنا دین جتلاتے ہو جبکہ اللہ جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب جانتا ہے اور اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔ وہ آپ پر احسان دھرتے ہیں کہ اسلام لے آئے کہہ دیجیے کہ اپنے اسلام لانے کا احسان ہم پر مت رکھو، البتہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کا راستہ چلایا اگر تم (واقعی) سچ کہتے ہو۔ بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کے ڈھکے چھپے سے واقف ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو اس پر اس کی پوری نگاہ ہے۔''

تحفۂ ربانی

اللہ تعالیٰ کے احسانات

اللہ تعالیٰ کے احسانات انسانوں پر بے شمار ہیں، وہ قدرت الٰہی کا شاہکار ہے، باقی کل مخلوقات انسان کی خدمت کے لیے مسخر ہیں، زمین، آسمان، سورج، چاند ستارے، پہاڑ، دریا، ہوا، پانی، زمین کے اندر خزانے، سمندر کی مچھلیاں، ہیرے جواہرات، تیل کے چشمے، سونے چاندی کی کانیں، یہ ساری نعمتیں تمام انسانوں کے لیے ہیں، نہ اس میں کالے گورے کا کوئی فرق ہے نہ امیر غریب کا، نہ اس میں خاندان کی کوئی تقسیم ہے، نہ علاقے کی، ہر انسان کے لیے اللہ نے ضرورتیں رکھی ہیں، اور وہ ان کو پورا کرنے کے لیے اللہ کی دی ہوئی عقل کا استعمال کرتا ہے، دنیا کی ان نعمتوں میں اللہ تعالیٰ نے ایسا عموم رکھا ہے کہ اس میں کسی کا کوئی امتیاز نہیں، جو چاہے اپنی عقل وذہانت کا استعمال کرے اور جدوجہد کرکے جہاں تک چاہے ترقی کرتا چلا جائے۔

سب سے بڑا احسان

لیکن ان تمام نعمتوں میں اس کی سب سے بڑی نعمت ایمان ہے، جس کی توفیق ہر ایک کو نہیں ہوتی، جو بھی اس کی نگاہ رحمت کا مستحق ٹھہرے، جس کو چاہے جہنم کے گڑھے سے نکال کر جنت کی بلندیاں عطا فرمادے، راستہ اس نے بتادیا: ﴿مَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے نہ مانے) بیشک انسان تو اس میں پورا اختیار ہے، لیکن توفیق اسی کے ہاتھ میں ہے۔

حضرت ابوطالب محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب چچا، محسن اسلام، لیکن ایمان مقدر میں نہیں تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''چچا کان میں ایک

مرتبہ اقرار کرلیجیے، گواہی دے دیجیے۔'' (۱) لیکن جواب یہ ہے کہ قوم کیا کہے گی۔ قرآن مجید میں صاف کہہ دیا گیا: ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ أَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (آپ جس کو چاہیں اس کو ہدایت دے دینا آپ کا کام نہیں، ہاں اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے)۔

نعمت ایمان کی ہدایت اسی کے ہاتھ میں ہے، عم رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل ''وحشی'' جن کے سامنے آنے سے آپ کو تکلیف پہونچتی تھی، جاں نثار چچا یاد آجاتے تھے، رحمت الٰہی کا ہاتھ ان کو گمراہی کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان کی روشنی عطا کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر وہ اسلام قبول کرتے ہیں۔(۲)

توفیق الٰہی

ایمان وہ تحفۂ ربانی ہے وہ جس کو چاہے عطا فرمائے، جس کو یہ نعمت گھر بیٹھے مل گئی وہ ہزار بار شکر کرے، سراپا شکر وسپاس بن جائے تو بھی شاید حق ادا نہ ہو، اپنے بارے میں خوش گمانی کبھی کبھی انسان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے، نیکی کا چھوٹے سے چھوٹا عمل انسان اللہ کی توفیق سے کرتا ہے۔

یہی دو باتیں سورۂ حجرات کی آخری آیات میں کہی جارہی ہیں، یہاں بات یہ کہ انسان اپنے کیے ہوئے کسی کام کے سلسلہ میں اس خوش فہمی کا شکار نہ ہو کہ وہ کام اس نے مکمل طریقہ پر کرلیا، اور اس کا حق ادا کردیا، اس میں دسیوں خامیاں ہوسکتی ہیں، جن کی طرف اس کی نگاہ نہیں پہنچ رہی ہے، دوسری بات یہ کہ وہ عمل کی نسبت اپنی ذات کی طرف نہ کرے، حقیقت تو یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی انسان اللہ کے حکم اور اس کی توفیق کے بغیر نہیں کرسکتا، ایمان تو بہت بڑی چیز ہے، کوئی اس دھوکہ میں نہ رہے کہ اس نے اس دولت کو خود حاصل کرلیا، ہر ایمان والے کو سراپا سپاس

ہونا چاہیے۔

غلط فہمی کا ازالہ

بنواسد کا وفد آیا تو وہ ان دونوں غلط فہمیوں کا شکار تھا ایک تو ان کو یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ وہ ایمان لائے ہیں اور بغیر کسی دوسرے کی کوشش کے ایمان لائے ہیں، اس پر ان کو ناز تھا، اور وہ اس کو اسلام اور رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک احسان تصور کررہے ہیں، دوسرا خیال ان کو یہ تھا کہ دولت ایمان پوری طرح حاصل کر چکے ہیں، جبکہ وہ اس وقت صورت اسلام سے واقف تھے، حقیقت ایمان سے ان کو واقفیت نہیں ہوئی تھی، اسی لیے پہلے ہی مرحلہ میں ان سے کہہ دیا گیا کہ:

﴿قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلٰكِنْ قُوْلُوا أَسْلَمْنَا﴾

''آپ کہہ دیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے، ہاں یہ کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں۔''

جب یہ بات ان سے کہی گئی تو شاید انھوں نے اور صراحت اور مزید قوت سے کہا کہ ہم مسلمان ہی ہیں، اور ایمان ہم پوری طرح قبول کر چکے ہیں، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿قُلْ أَتُعَلِّمُونَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْئٍ عَلِيْمٌ.﴾ (۱)

''آپ فرما دیجیے کہ کیا تم اللہ کو اپنا دین جتلا رہے ہو، جبکہ اللہ جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے اس کو جانتا ہے اور اللہ ہر چیز کا بخوبی علم رکھتا ہے۔''

آیت میں بات بالکل صاف کردی گئی کہ تم بڑے زور شور سے جس ایمان کا اظہار کررہے ہو بلکہ جتلا رہے ہو، اس کی ضرورت نہیں، اللہ تمہارے دلوں کی حقیقت سے واقف ہے۔

وفد نے آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے اس احسان کا ذکر کیا کہ قبائل ہوازن وغطفان اور محارب نے آپ سے جنگیں کیں، ہم بغیر قتال کے خود آئے اور پھر اپنے اہل وعیال واموال لے کر آئے، یہ امتیاز صرف ہم ہی کو حاصل ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے احسان جتانے کا تذکرہ کیا ہے:

﴿يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا﴾

''وہ آپ پر احسان رکھتے ہیں کہ وہ مسلمان ہو گئے۔''

اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہ آئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے خیالات درست کرنے کا حکم فرمایا:

﴿قُلْ لَّا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ﴾

''آپ کہہ دیجیے کہ تم اپنے اسلام کا احسان ہم پر نہ رکھو۔''

اور پھر اصل حقیقت کی طرف رہنمائی فرمائی اور ارشاد ہوا:

﴿بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ.﴾(۱)

''بلکہ تم پر اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی راہ دی، اگر تم سچ کہتے ہو۔''

یہ کلام الٰہی کا اعجاز ہے، پہلے کہا جا چکا ہے کہ تم مومن نہیں ہو بلکہ مسلمان ہو، اور ایمان چونکہ احسان خداوندی کا تذکرہ ہے، اس لیے خود ان کے اپنے خیال کے مطابق یہ کہا جا رہا ہے اور اگر تم اپنے آپ کو صاحب ایمان سمجھتے ہو اور اگر تم اپنے اس خیال میں سچے بھی ہو تو یہ سمجھ لو کہ یہ تم پر اللہ کا احسان ہے کہ اس نے توفیق دی، دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے اس کو الٹتا پلٹتا ہے۔

قرآن مجید کتاب ہدایت ہے، اس نے بدوؤں کے قصہ کو اس لیے پیش کیا تا کہ قیامت تک امت سبق حاصل کرتی رہے، جس کو بھی ایمان مل جائے، خیر کی توفیق حاصل ہو جائے، وہ اس حقیقت کو نہ بھولے کہ یہ سب کچھ فضل الٰہی ہے، ہم کچھ بھی

کرتے ہیں، اللہ کے حکم سے کرتے ہیں، اس کے نتائج اللہ کے حکم سے سامنے آتے ہیں، کسی کو اپنے عمل پر ناز نہ ہو، وہ اللہ کا شکر گذار رہو اور سر نیاز خم کر دے۔

آخری بات

سورۂ شریفہ کی آخری آیت میں بات صاف کر دی گئی ہے کہ ایک آدمی جتنا بھی جتلائے اور اپنے اسلام کا دعویٰ کرے، اچھے اعمال کا تذکرہ کرے لیکن اللہ حقیقت حال سے خوب واقف ہے، کسی کے کہنے سے اور باور کرانے سے کچھ نہیں ہوگا جب تک حقیقت نہ ہو، صورت وحقیقت کا فرق سب جانتے ہیں، تنہا صورت وشکل بنا لینا اور ظاہر اختیار کر لینا کافی نہیں ہے جب تک حقیقت کی روح نہ پیدا کی جائے۔

اس آیت کا اس سے پہلے کی آیتوں سے تو بہت واضح ربط ہے ہی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ پوری سورہ کی جان ہے، شروع سے لے کر اب جتنے احکامات دیے گئے ان سب کے اندر حقیقت پیدا کرنے کی اس میں تلقین کی جا رہی ہے، اور یہ اسلام کی بڑی خصوصیت وامتیاز ہے کہ اس نے صورت کو حقیقت کے ساتھ جوڑا ہے اور اس میں جان پیدا کی ہے، اس سے عمل کے اندر وہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے اور ایسے نتائج سامنے آتے ہیں کہ بعض مرتبہ آدمی کو ان کا تصور بھی نہیں ہوتا، اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب اللہ کی اس صفت کا استحضار رہے کہ وہ آسمانوں اور زمین کے ڈھکے چھپے سے واقف ہے، سینوں کے راز اس کے پاس ہیں، اندر کی کیفیتوں کو وہ خوب جانتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾

”بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کے ڈھکے چھپے سے واقف ہے۔“

﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (۱)

”اور جو کچھ تم کرتے ہو اس پر اس کی پوری نگاہ ہے۔“

آدمی اپنے کیے پر کیسا ہی پردہ ڈالے لیکن وہ اپنے خالق و مالک سے کچھ چھپا نہیں سکتا، جس کے دربار میں حاضر ہونا ہے اور اپنے کاموں کا حساب دینا ہے، اس کا استحضار انسان کو ہزار خرابیوں سے بچا سکتا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ معاشرہ کی اصلاح میں اس کی خاص اہمیت ہے، ایک روسی مفکر نے یہ بات لکھی ہے کہ ''سماج کو سنوارنے کا سب سے بڑا ذریعہ آخرت کی جزا وسزا کا یقین ہے'' یقین جتنا بڑھتا جاتا ہے زندگی سنورتی جاتی ہے، پھر انسان پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے اور ڈرتا ہے کہ کوئی کام مالک کی مرضی کے خلاف نہ ہو جائے کہ اس کے نتیجہ میں آخرت کی پکڑ کا سامنا کرنا پڑے۔

حاصل یہ کہ صفات حمیدہ پیدا کرنے اور زندگی کو صحیح رخ پر ڈالنے کا یہ سب سے قیمتی نسخہ ہے، ضرورت ہے اس کے یقین کو بڑھانے کی اور اسے آزمانے کی۔